گجرات فائلس

پسِ پردہ حقائق کا انکشاف



رعنا ایوب

ترجمہ

محمد ضیاء اللہ ندوی

پیش لفظ

جسٹس بی این سری کرشنا

'اس کتاب میں شامل سینئر افسروں اور پولیس اہل کاروں سے کیے گئے مکالمات اس ملک کی عدالتوں میں زیر سماعت متعدد معاملوں کے شواہد کو سیاق وسباق اور تقویت فراہم کرتے ہیں۔ یہ جرائم نہایت ہی سنگین ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ایسے مجرموں کے ساتھ کیا رویہ روا رکھیں گے جو اس ملک کے طاقت ور ترین افراد میں سے ہیں؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے ہمارا خود اپنے ساتھ کیا برتاؤ ہو جب کہ ہم نے ہی انھیں اقتدار تک پہونچایا ہے۔'

اروندھتی رائے

'**گجرات فائلس** ایک جرأت مندانہ اور اہم کتاب ہے۔'

رامچندر گہا

'رعنا جیسی آوازوں کے بغیر ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہوتا جو سیاسی طور پر 'معقول' تاریخ' کا ملغوبہ بن کے رہ جاتا۔ میں رعنا کا مشکور ہوں جنہوں نے اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے۔'

ہنسل مہتا

'جنھیں اداروں اور عدلیہ کے نظاموں کی پروا ہے، **گجرات فائلس** ان کے لیے ایک بانگ جرس ہے۔'

آوٹ لک

₹260
ISBN: 978-81-933600-0-2



Non fiction

mazameen
مضامین.com
تجزیے · مقالات · ادب

گجرات فائلس

پسِ پردہ حقائق کا انکشاف

رعنا ایوب

ترجمہ

ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ ندوی

مضامین
پبلکیشنز

انتساب

مکل سنہا اور شاہد اعظمی کو معنون
جنھوں نے مجھے لڑنے کے لیے ایک مقصد دیا۔
ابا اور امی کے نام۔

ترتیب

عرضِ ناشر

ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جہاں سچ ایک نایاب شے ہے۔ سچ کو دبانا در حقیقت حکومتوں، سیاست دانوں، سرکاری حکام اور ذرائع ابلاغ کے لیے فائدے کا سودا ہے۔ سچ جاننے والے خطرناک لوگ گردانے جاتے ہیں، اور سچ کو تلاش کرنے والوں اور اسے بے نقاب کرنے والوں کو سنسر کیا جاتا ہے۔ ہنٹر تھامپسن نے کہا تھا: 'پیشہ ورانہ صحافت کے سیاق میں مطلق صداقت انتہائی نایاب اور خطرناک شے ہے۔'

ایسا ہی معاملہ کچھ اس کتاب کا ہے۔ زیر نظر کتاب رعنا ایوب کی انگریزی کتاب Gujarat Files: Anatomy of a Cover Up کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ان حقائق کی نشان دہی کی ایک جرأت مندانہ کوشش ہے جو ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات اور گجرات میں کیے گئے متعدد فرضی انکاؤنٹروں کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ اس کتاب کی مصنفہ نے بڑی بہادری سے انڈر کور رہ کر گجرات کے ان سرکاری حکام اور اعلیٰ عہدے داروں کو اسٹنگ کیا ہے جو ۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۰ء کے دوران گجرات میں کلیدی عہدوں پر براجمان تھے۔ اس پورے اسٹنگ آپریشن سے نہ صرف اسٹیٹ کے ملوث ہونے کے واضح اشارے ملتے ہیں بلکہ ان سیاست دانوں کا کردار بھی مشکوک نظر آتا ہے جو بدقسمتی سے آج بھارت کے اقتدار پر قابض ہیں۔ اردو میں اس جرأت مندانہ کتاب کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے ہمیں انتہائی خوشی ہو رہی ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں بہت سے احباب نے ہمارا تعاون کیا ہے، جن کا فرداً فرداً

ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو ہم خدائے بزرگ و برتر کی بے پایاں رحمتوں کے لیے سجدہ ریز ہیں جس نے ہمیں اس کام کی توفیق بخشی۔

کتاب کی مصنفہ رعنا ایوب صاحبہ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ جنھوں نے ہمیں نہ صرف اپنی اس معرکہ آرا کتاب کے ترجمے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اس کی رسم اجرا کی تقریب میں شرکت کے لیے دہلی بھی تشریف لائیں۔ یہ بات کتاب کے تئیں ان کی ذاتی دل چسپی اور سچ کو منظر عام پر لانے کے جذبے کی غماز ہے۔

ہم کرشنا مینن صاحب اور شبنم ہاشمی صاحبہ کے لیے بھی سراپا سپاس ہیں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں خصوصی دل چسپی لی۔

کتاب کے مترجم مضامین ڈاٹ کام کے ادارتی رکن ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ ندوی نے انتہائی عرق ریزی اور جاں فشانی سے ترجمے کے کام کو انجام دیا ہے، ان کا خصوصی شکریہ۔ اس ترجمے میں مترجم نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ ترجمہ حتی الوسع اصل متن کے قریب رہے لیکن بامحاورہ اور رواں بھی ہو اور کتاب کی زبان سادہ و عام فہم رہے۔ یہ یقیناً ایک مشکل کام تھا جسے مترجم نے بطریق احسن انجام دیا ہے جس کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ان احباب کو ہدیۂ تشکر نہ پیش کیا جائے جنھوں نے مسودے کی تیاری، صفائی اور نظر ثانی کے لیے تعاون دیا۔ ہم ڈاکٹر ابو معاذ فلاحی، آفتاب عالم فلاحی، عبدالحی فلاحی اور رمیض احمد تقی صاحبان کے انتہائی مشکور ہیں جنھوں نے مسودے کی تیاری سے لے کر آخری پروف پڑھنے تک کے تمام مراحل میں ہماری مدد کی اور ترجمے کی زبان و بیان کو بہتر بنانے میں گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ کتاب کی ٹائپنگ کے لیے احمد تشنہ اور اس کی تزئین کاری کے لیے مبشر حسین صاحبان کا بھی شکریہ۔ مضامین ڈاٹ کام کے سرپرست محمد شاہد خان صاحب اور ڈائریکٹرز خالد سیف اللہ اثری اور عرفان وحید صاحبان کا بھی بے حد شکریہ جنھوں نے نہ صرف مسودے کو حتمی شکل دی بلکہ کتاب کی

اشاعت کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے پیش پیش رہے۔ ہمارے تقسیم کار منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز اور فاروس میڈیا کے بھی ہم انتہائی شکر گزار ہیں، خاص طور سے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان۔ کتاب کے نئے ایڈیشن میں بے لوث خدمت کے لئے جناب گوہر اقبال صاحب (منشورات، دہلی) کے بھی ہم انتہائی مشکور ہیں۔ ان کے علاوہ ہم مضامین ڈاٹ کام کی جملہ ادارتی ومشاورتی ٹیم کے بھی سپاس گزار ہیں جنہوں نے طباعت کے مختلف مراحل میں ہمارا ساتھ دیا۔

ہر چند کہ کتاب کی تیاری کے دوران انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ یہ زبان وبیان کے اسقام سے مبرا اور ترجمے کی اغلاط سے پاک رہے۔ لیکن ہر عیب سے پاک ذات تو بس اللہ رب العزت کی ہے۔ ہم اپنے قارئین کے انتہائی مشکور ہوں گے اگر وہ اغلاط کی نشان دہی فرمادیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں انھیں دور کیا جاسکے۔

مضامین ڈاٹ کام

تقریظ

हरिण्मयेन पात्रेण सत्यसाहपहतिं मुखं ।
तत्त्वं पुषन्नपावृणु सत्यधमााय दृष्टये ।।

حقیقت کا چہرہ طلائی مکھوٹے میں چھپادیا گیا ہے،

اے پوشان، اٹھو اور سچے دھرم کی خاطر اس کی نقاب کشائی کرو۔

—ایشوسیہ اپنشد

مارک ٹوین نے کہا تھا: 'حقیقت افسانے سے عجیب تر ہوتی ہے، تاہم اس کی وجہ یہ کہ ہے افسانے کو صرف ممکنات کی دنیا تک محدود رہنا پڑتا ہے، حقیقت کو نہیں۔' لیکن حقیقت کی ماہیت کیا ہے؟ اس سوال کے حل کے لیے تمام دنیا کے فلسفی سرگرداں رہے ہیں۔ کاسۂ مقدس کی طرح مختلف زمان و مکان میں مختلف افراد نے اسے مختلف طریقے سے سوچا ہے۔ جو لوگ یکسوئی کے ساتھ حقیقت کی تلاش میں نکلتے ہیں انھیں لازمی طور پر تن تنہا ہی ایسے راستے پر جانا پڑتا ہے جو ابتلا اور آزمائشوں سے پُر ہوتا ہے اور جہاں انھیں کسی سہارے کے ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ بس انسان کا اپنا ضمیر ہی اس کا واحد رہنما ہوتا ہے۔

۲۰۰۲ء کے دوران گجرات میں پریشان کن واقعات کی حقیقت کا یہ ورژن فرضی انکاؤنٹروں کے پس پردہ حقائق کی ایک دل چسپ روداد ہے۔ مصنف کے مطابق، یہ کتاب قاری کو جاسوسی کیمرے اور مائکروفون کے ذریعے بصیرت فراہم کرتی ہے جن کا استعمال

ایک طویل مدتی اسٹنگ آپریشن میں خوب کیا گیا۔ یہ فیصلہ قاری کو کرنا ہے کہ اس کتاب میں پیش کردہ مواد حقائق کی نمائندگی کرتے ہیں یا محض ایک نقطۂ نظر فراہم کرتے ہیں۔

یہ روداد جس میں جابجا مکالمات بھی پیش کیے گئے ہیں دل چسپ ہے۔ اب یہ امر قانون نافذ کرنے والے ریاستی اپریٹس اور آئینی مشینری پر موقوف ہے کہ وہ اس کتاب میں بیان کردہ حقائق کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور ضروری کارروائی کریں تاکہ یہاں کے نظام قانون کے تیئں اس ملک کے شہریوں کا اعتماد بحال ہو۔

دسمبر ۱۹۹۲ء تا جنوری ۱۹۹۳ء کے دوران میرے لیے ممبئی کے وہ تجربات خاصے تکلیف دہ رہے جو مجھے فسادات اور پرتشدد واقعات کی تفتیش کے لیے مقرر کردہ انکوائری کمیشن کے ذریعے ملے۔ میں نے پایا کہ فسادات کے متاثرین کے تیئں واضح بے حسی برتی گئی تھی۔ اس احساس کے بعد اب لگتا ہے کہ یہی مناسب وقت ہے کہ ریاستی مشینری اور آئینی عہدے دار اس قسم کے فسادات کی وجوہات کی تحقیقات میں گہری سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور مناسب اقدامات کیے جائیں تاکہ دوبارہ ایسے واقعات رونما نہ ہوں۔

اگرچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ زیر دست کتاب میں پیش کردہ تمام مواد کی توثیق کی جاسکے، تاہم مصنف کی جرأت اور جذبے کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا جس کا مظاہرہ انھوں نے شواہد کو بے نقاب کرنے کے لیے کیا اور جو ان کے یقین کے مطابق حقائق پر مبنی ہیں۔ تفتیشی صحافت میں اس غیر معمولی جرأت کے لیے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو سلام۔ بڑھتی ہوئی بے ایمانی، فریب کاری اور سیاسی ریشہ دوانیوں کے پیش نظر اس کی ضرورت بھی بڑھ رہی ہے۔

ممبئی، ۱۱؍اپریل ۲۰۱۶ء

جسٹس بی این سری کرشنا

پیش گفتار

قوت کے خلاف انسان کی پنجہ آزمائی ویسے ہی ہے
جیسے بھولنے کے خلاف یادداشت کی جدوجہد۔

— میلان کنڈیرا

میری یادداشت کا ایک بھیانک حصہ ان دنوں کا ہے جب میں کچھ مدت کے لیے ۲۰۰۷ء میں ایک نیوز چینل کے لیے رپورٹنگ کیا کرتی تھی۔ میونسپل ہسپتال میں ایک تین سالہ بچی داخل تھی جس کی عصمت دری کی گئی تھی۔ اس کے والدین جو ایک ٹریفک سگنل پر پائریٹڈ کتابیں فروخت کیا کرتے تھے، اس وقت نشے کے زیر اثر تھے اور اپنی پانچ لڑکیوں میں سے ایک کے ساتھ پیش آئی مصیبت سے یکسر لاعلم تھے۔ بچی کے چہرے اور جسم کو بری طرح نوچا گیا تھا۔ اس معصوم کے پورے جسم پر وحشت و بربریت کا اندوہ ناک مظاہرہ کیا گیا تھا۔ دہلی اسٹوڈیو کو اسٹوری کا ٹیپ بھیجنے کے بعد جب میں گھر پہنچی تو رات کے دو بج رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں رات بھر تفتیشی افسر کو یہ جاننے کے لیے پیغامات پر پیغامات بھیجتی رہی تھی کہ آیا مجرم پکڑا گیا یا نہیں۔ اگلے دن میں بچی کی خیریت جاننے کے لیے پھر ہسپتال پہنچی۔ اسے بہت سارے انفیکشن ہو گئے تھے۔ مکھیوں نے اس کے زخموں پر یلغار کر دی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کلائیوں میں سوئیاں گڑی تھیں۔ اس کے والدین اب بھی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ میں اپنے آفس پہنچی تو میں نے اپنے باس سے درخواست کی کہ اس معاملے کو

زیادہ اہمیت دیں تا کہ مجرم پکڑے جاسکیں اور انھیں انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاسکے۔ وہ صرف مسکرایا اور اپنے لیپ ٹاپ کو گھورتا رہا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ باس نے مجھ سے کہا کہ میں میلان سب وے اور بارش پر توجہ دوں اور سیلاب کے کچھ اچھے شاٹس حاصل کروں۔

جب میں میلان سب وے کے راستے میں تھی جو ممبئی کے مشہور مانسون کے دوران کیمرا پرسنز کا پسندیدہ مقام ہے، تو میں نے اپنی ماں کو فون کیا۔ 'میں یہ نہیں کر سکتی،' میں نے اپنی ماں سے کہا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں پورے دن کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ اس واقعہ کے تیسرے دن میرے فیملی ڈاکٹر کو مجھے سکون آور انجکشن دینا پڑا۔ میں نے اپنے ایڈیٹر کو فون کرکے بتایا کہ شاید مجھے ایک ہفتہ آرام کی ضرورت ہے۔ ان دنوں معصوم بچی کی اسٹوری سے کچھ ہی پہلے میں اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (سیمی) پر تحقیقات کر رہی تھی اور اپنے ایڈیٹر سے صحافت میں اخلاقیات اور اقدار کے موضوع پر الجھ پڑی تھی۔ اس نے میری بات انتہائی سکون سے سنی اور اور پھر کچھ ایسا کہا جو میرے ذہن میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔

ایک اچھے صحافی کو اسٹوری سے خود کو علیحدہ رکھنے کا فن سیکھنا چاہیے اور اسے عملی ہونا چاہیے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج تک میں اس 'فن' میں مہارت حاصل نہیں کر پائی۔ خاص طور پر اس لیے کہ بسا اوقات کارپوریٹ اور سیاسی قوتوں کی شہ پر اسٹوری کا گلا گھونٹنے کے لیے اسے بطورِ عذر استعمال کیا جاتا ہے۔

رعنا ایوب

باب اول

۲۰۱۰ء کا موسم گرما میرے لیے صحافت کی گویا ایک نئی تعریف لے کر آیا تھا۔ میں بزعم خود ایک محنتی اور اوسط درجے کی رپورٹر تھی جس کے اپنے کچھ آئیڈیل تھے جو مجھے میرے روایتی صحافی والد سے ورثے میں ملے تھے۔ لیکن اس وقت میں نے پایا کہ میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جو خدا کرے کسی صحافی کو زندگی میں کبھی پیش نہ آئے۔

ایک طویل رخصت علالت کے بعد ۲۰۱۰ء میں میں نے تہلکہ کے آفس میں اپنا کام دوبارہ شروع کیا تھا۔ شہر کے تمام ڈاکٹر مل کر بھی میرے مرض کی تشخیص نہیں کر سکے۔ حال ہی میں نکسل تحریک کے مرکز گڑھ چرولی سے ایک اسائنمنٹ کر کے لوٹی تھی۔ اس اسٹوری سے قبل ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جسے میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ مانتی ہوں۔ ایک بہت ہی عزیز دوست شاہد اعظمی کا قتل کر دیا گیا تھا۔ اعظمی جو فوجداری قانون کی دُنیا کا ایک بہترین دماغ تھا، میری زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کی وفات کی شام میں اس سے ملاقات کر کے ان قبائلی افراد اور دانشوران کے متعلق گفتگو کرنے والی تھی جن پر حکومت وقت نے نکسل ہونے کا ٹھپہ لگایا تھا اور وہ سب جھوٹے مقدمات میں جیلوں میں سڑ رہے تھے۔

لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں اپنی بھتیجی کی ضد کی وجہ سے اس سے ملنے نہ جا سکی اور گھر پر ہی رک گئی۔ اس دن میری بھتیجی کی ساتویں سال گرہ تھی۔ میں نے بعد میں دیکھا کہ میرے فون پر درجنوں مسڈ کال اور پیغامات تھے جو مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ شاہد پر کیا گزری؟ بقیہ حالات مجھے دوستوں کے لامتناہی فون کے سلسلے اور نیوز چینلوں کی بریکنگ

نیوز سے معلوم ہوئے۔ کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے شاہد کو 'اینٹی نیشنل ایلیمنٹس' کے مقدمات کی پیروی کرنے کی پاداش میں اس کے دفتر میں گولی ماردی تھی۔ حال ہی میں شاہد کے دلائل کی وجہ سے ۱۱/۷ ممبئی ٹرین دھماکے میں پھنسائے گئے معصوموں کو رہائی نصیب ہوئی تھی۔ اس کی وفات کے بعد ممبئی کی عدالتوں نے ان دو ملزموں کو بَری کر دیا جن پر ۲۶/۱۱ ممبئی حملوں میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ شاہد کے قتل کے پس پشت کون سا سازشی دماغ کارفرما تھا اس کی گتھی آج تک سلجھ نہیں سکی ہے۔ کم سے کم عوام کی نظروں میں تو معاملہ ایسا ہی ہے۔

نقصان سے نمٹنے کے کئی طریقے ہیں۔ آپ ماتم کریں یا بھول جائیں یا پھر آپ اس سے دور چلے جائیں اور اپنے کام میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ میں نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس کی وفات کے تیسرے دن میں ایک ایسی اسٹوری کرنے کے لیے ناگپور کے لیے روانہ ہو چکی تھی جو میری صحافتی زندگی کی ایک انتہائی اہم اسٹوری ثابت ہوئی۔ یہ اسٹوری طلبا کی گرفتاری سے متعلق تھی۔ ان میں سے زیادہ تر طلبا پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے اور ان پر نکسلی ہونے کا الزام تھا۔ ان کے خلاف جو ثبوت پیش کیے گئے تھے وہ مضحکہ خیز تھے۔ الزام تھا کہ ان کے پاس سے بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد سے متعلق لٹریچر برآمد ہوا ہے۔ اس واقعہ سے مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی گزشتہ کیفیت کی طرف لوٹ آئی ہوں کیوں کہ میرے دوست شاہد کی موت اسی قسم کے مقدمات کی پیروی کرتے ہوئے ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ میری طرف سے اسے ایک خراجِ عقیدت ہوگی۔ تاہم قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے ایک ناقابل توضیح مرض کی وجہ سے گھر لوٹنا پڑا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ڈپریشن تھا۔

تشخیص تب ہوئی جب میرے گھبرائے ہوئے والدین نے میری ہر قسم کی جانچ کروا دی۔ برونکواسکوپی سے لے کر ایم آر آئی تک سب معائنے ہو چکے تھے۔ ایک دوسرے ڈاکٹر نے تو میرے والدین کو یہاں تک مشورہ دے دیا کہ وہ مجھے ٹی بی کی دوائیاں دینا شروع کر دیں۔

لیکن قسمت اچھی تھی کہ اتفاق سے مجھے ممبئی کے ایک بہت مشہور فزیشین کا پتہ چلا۔ ان کا گھر جنوبی ممبئی میں واقع تھا۔ ڈاکٹر چٹس نے میری رپورٹیں دیکھی اور مجھ سے چند سوالات پوچھے۔ پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد پوچھا: 'تم پریشان کس چیز سے ہو؟' مجھے لگا گویا ان کے الفاظ نے مجھے غنودگی سے بیدار کر دیا۔ 'کچھ بھی تو نہیں، ڈاکٹر صاحب' میں نے جواب دیا۔ 'بس میں خاصی کمزوری محسوس کرتی ہوں اور کچھ سمجھ نہیں پاتی کہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟'

ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے کہا: 'خود پر ترس کھانا بند کرو۔ خون کی ان جانچوں سے اپنی کیفیت کو خواہ مخواہ بڑھاؤ مت۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ اپنے کام پر لگ جاؤ۔ یہی تمہارا علاج ہے۔ یہ سب صرف تمہارے ذہن کی اُپج ہے۔'

'کیا یہ ہائپوکونڈریا ہے؟' میں نے پوچھا۔ یہ اصطلاح حال ہی میں مجھے اس وقت معلوم ہوئی تھی جب میں خود اپنے مرض کی تشخیص کرنے کی کوشش میں لگی تھی۔ 'نہیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ تم ذرا کاہل ہو گئی ہو اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار چاہتی ہو۔' ڈاکٹر چٹس نے جواب دیا۔

اگلے دو چار روز تک میں ڈاکٹر چٹس کے مشورے کا مطلب نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ کاہلی کے ان ہی ایام کی بات ہے، ایک دن میری والدہ نے میرے اندر تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ اماں، میری سب سے اچھی دوست ہیں۔ انھوں نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ ابا ہی ان کے استاد تھے۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ میرے ذریعے اپنے خوابوں کو جینا چاہتی ہیں۔ جب بھی میں بغاوت پر اترتی تو وہ میری طرف داری کرتیں، میرے لیے جوڑ توڑ کرتیں اور آخر گھر میں سب کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر ڈالتیں۔ اس دن کافی کی پیالی دیتے ہوئے انھوں نے مجھ سے پوچھا، 'تو کیا تم اپنا کام چھوڑ رہی ہو؟'

میں نے کندھے اچکائے۔ میری دل چسپی صرف کافی میں تھی جو وہ میرے لیے لائی تھیں۔ لیکن وہ کب ماننے والی تھیں، اپنی خاص عادت کے مطابق بستر پر میرے قریب بیٹھ

گئیں اور انقلاب (معروف اردو روزنامہ) پڑھنے لگیں۔ دس منٹ تک اخبار پڑھنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں نے انھیں درمیان ہی میں روکتے ہوئے کہا: 'اماں، اگر آج کے اس اخبار میں کوئی بھاشن ہے، تو مجھے معاف ہی رکھیے، میں اس کے بغیر ہی بھلی۔'

'ارے نہیں، تم نے سہراب الدین کے بارے میں پڑھا ہے؟' انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ یہ نام سن کر میری دلچسپی بڑھ گئی۔ دل ہی دل میں میں نے سوچا کہ کیوں نہیں، سہراب الدین کو میں کیسے نہ جانوں۔ ہمارے دور کی سب سے متنازع شخصیتوں میں سے ایک، نریندر مودی، سے پہلی بار میں اسی کے سبب توروبرو ہوئی تھی۔

۲۰۰۷ء میں گجرات کے تین اعلیٰ افسران سرخیوں میں تھے کیوں کہ ان کے قریب ترین رفیق کار (colleague) رجنیش رائے نے انھیں ایک ادنیٰ درجے کے مجرم سہراب الدین کو فرضی انکاؤنٹر میں قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔

ڈی.جی ونجارا اور راج کمار پانڈیان سلاخوں کے پیچھے تھے۔ یہ مودی انتظامیہ کے سب سے بااعتماد افسروں میں سے تھے اور اس وقت تک بڑی شان کی زندگی جی رہے تھے۔ اخبارات بڑے نمایاں طور پر ان کی پریس کانفرنس کی تصویریں روزانہ شائع کرتے تھے۔ یہ وہ افسران تھے جنھوں نے کامیابی کے ساتھ ان جہادیوں کا سراغ لگا کر انھیں ختم کیا تھا جو اس سے قبل ۲۰۰۴ء میں ہندو ہردے سمراٹ نریندر مودی کے قتل کے درپے تھے۔ اس لیے یہ فطری بات تھی کہ پورے ملک کی توجہ ان کی گرفتاری کی طرف مبذول ہو جائے۔

۲۰۰۷ء میں ایک ٹی وی چینل میں بطور سیاسی صحافی نوکری حاصل ہونے کے بعد مجھے پہلی ذمہ داری یہ سونپی گئی کہ میں اس سال ہونے والے گجرات کے انتخابات کو کور کروں۔ بیشتر تجزیہ نگاروں کے مطابق، وزیر اعلیٰ گجرات نریندر مودی ایک بار پھر مکمل جیت درج کرنے والا تھا۔ ۲۰۰۲ء کے فرقہ وارانہ فسادات نے سماج کو تقسیم کر ڈالا تھا اور نریندر مودی کو ہندو اکثریت والی آبادی کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ۲۰۰۷ء میں مکمل جیت مودی کے لیے زیادہ مشکل

نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

اپنے کیمرہ مین کے ہمراہ میں اس کی پہلی انتخابی ریلی کی جگہ پر پہنچ گئی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہاہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس ریلی کا انتظام گجرات چیمبر آف کامرس نے کیا تھا۔ نریندر مودی اپنے دیگر وزرا کے علاوہ اپنے دست راست امت شاہ کے ساتھ اسٹیج پر موجود تھا۔

وہاں اور بھی دیگر سیاسی ریلیاں ہوئی تھیں جن سے متعلق خبروں کا احاطہ میں نے کیا تھا اور اسی لیے پہلی نظر میں یہ ریلی بھی کچھ مختلف معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن جیسا کہ دہلی میں موجود میرے پروڈیوسر نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا کہ مودی کو اشتعال انگیز تقریریں کرنے کی عادت ہے۔ اس دن بھی اس نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ مودی نے کہا: 'سہراب الدین! مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ سہراب الدین جیسے آتنک وادیوں کے ساتھ میں کیا کروں؟' اتنا سننا تھا کہ ہجوم جھوم اٹھا۔ اگلی قطار میں موجود عورتیں تالیاں بجانے لگیں۔ پہلی قطار ہمیشہ عورتوں کے لیے خاص رکھی جاتی تھی کیوں کہ ایسا مانا جاتا تھا کہ گجراتی خواتین کے درمیان مودی زیادہ مقبول ہے۔ کالم نگار آکار پٹیل نے اپنے ایک کالم میں یہ لکھا ہے کہ گجراتی خواتین کے لیے مودی جنسی علامت (sex symbol) کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہجوم کا رد عمل عین متوقع تھا۔ لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے: 'مارڈالو، مارڈالو'۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قدیم روم کے ایمفی تھیٹر کا منظر آنکھوں میں ابھر گیا ہو۔ مودی کی تقریر جاری رہی۔ وہ اپنی تقریر میں 'میاں مشرف' اور 'دلّی سلطنت' کے حوالے بھونڈے انداز میں دیتا رہا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد ڈائس سے جب مودی اترا تو گجرات چیمبر آف کامرس کے اراکین نے اس کی گل پوشی کی۔ تب تک بھیڑ اس کے ارد گرد جمع ہو چکی تھی۔ میں سکڑتے ہوئے بھیڑ میں داخل ہو گئی اور حفاظتی دستے کے گھیرے کو پار کر لیا۔ اس دوران میں اپنے کیمرہ مین ساتھی کو چیخ کر بلا بھی رہی تھی جو میرے پیچھے بھیڑ میں داخل ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

'مودی جی، مودی جی، ایک سوال' میں نے کہا۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ شخص جو اپنے مداحوں کے قافلے کے دوش پر آگے بڑھ رہا تھا، میری آواز پر پلٹا اور اس نے مجھے دیکھا۔ شاید اُسے یہ امید تھی کہ میں کوئی سیاسی نوعیت کا سوال پوچھنے والی ہوں۔ میں نے پوچھا: 'مودی جی، گجرات کے تین افسروں کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔ ان پر فرضی انکاؤنٹر میں سہراب الدین کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ تو کیا آپ نے اپنی تقریر میں جو کچھ ابھی کہا، اُسے جائز ٹھہرائیں گے؟' میں نے جواب کی امید میں اپنے مائیک کا رُخ ان کی طرف موڑ دیا۔ لیکن یہ لمحہ میرے کیمرہ مین ساتھی کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ نریندر مودی کم و بیش دس سیکنڈ تک مجھے گھور کر دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے وزیر نے مجھے پُرحقارت نظروں سے دیکھا۔ یہ میری اس شخص سے پہلی ملاقات تھی جو آج وزارت عظمیٰ جیسے ملک کے اہم ترین عہدے پر قابض ہے۔

سہراب الدین کی اصل اسٹوری کیا تھی؟ یہ معلوم کرنا ضروری تھا اور موقع خود میری ماں کے ذریعے آیا جب وہ انقلاب پڑھ رہی تھیں۔ میں ایک وجدانی کیفیت میں محلے کے سائبر کیفے کی طرف روانہ ہو گئی۔

انٹرنیٹ پر دستیاب سہراب الدین سے متعلق تمام لنکس میں سی بی آئی کی تفتیش اور گجرات کے ایک اعلیٰ پولیس افسر ابھے چوڑاسما کی گرفتاری کے حوالے تھے۔ چوڑاسما میرے لیے کوئی نامانوس نام نہیں تھا۔ محض ایک سال قبل ہی اس نے مجھے فون پر دھمکی دی تھی۔ اس وقت میں نے گجرات دھماکہ معاملہ میں اس کے ایک بڑے چہیتے گواہ کا اقبالیہ بیان شائع کیا تھا۔ چوڑاسما کو گجرات دھماکوں کی تفتیش کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور آخر کار ان دھماکوں کے ڈانڈے انڈین مجاہدین نامی جماعت سے جوڑ دیے گئے تھے۔ ریاست میں سب سے اچھا بولنے والے اور میڈیا شناس افسروں میں سے ایک سمجھے جانے والے چوڑاسما کے بارے میں یہ خبر گرم تھی کہ وہ گجرات کے وزیر داخلہ امت شاہ سے بہت قریب ہے۔ لیکن چوڑاسما ان

افسروں سے مختلف تھا جنھوں نے تیزی سے شہرت حاصل کی تھی۔ جیسا کہ بعد کے انکشاف سے معلوم ہو گا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے معمولی درجے کے مجرموں اور حوالہ اکاؤنٹس جیسے معاملوں کو سلجھانا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ سہراب الدین اس کا اپنا ہی معتبر ساتھی تھا۔

نوٹس اور پرنٹ آؤٹس کی تیاری کے ساتھ دہلی میں موجود اپنے ایڈیٹر شوما چودھری اور ترون تیج پال کے پاس میں نے اس معاملے سے متعلق ایک نوٹ لکھ کر روانہ کر دیا اور اس بات کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اس واقعے پر لکھا جانا چاہیے۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی موجود تھی کہ شاید اپنی خود ساختہ تنہائی اور ذہنی دباؤ کی گرفت سے آزادی کا یہی ایک راستہ ہو سکتا ہے۔ میرے دونوں ایڈیٹر توقع سے بڑھ کر حوصلہ افزا ثابت ہوئے۔ اور ایک بار پھر میں احمد آباد کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔

اپنی آمد کے ایک مہینے کے اندر میں نے دو اہم انکشافات کیے۔ اس سلسلے میں کال ریکارڈس اور داخلی نوٹس کھنگالنے کی ضرورت پڑی تھی۔ میری مدد ان افسروں نے کی تھی جو ہمیشہ گمنام رہیں گے۔ میں نے ان سے بڑے محتاط انداز میں روابط پیدا کیے تھے۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ یہی افسر میری واحد امید ہیں۔ لیکن گجرات جیسی ریاست میں اعتماد حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے، جہاں ایمان داری سے اپنی ذمہ داریاں نبھانے والے افسروں کو حکومت کے غضب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے اکثر تو وہ تھے جن سے پہلی بار میری ملاقات ہو رہی تھی۔ اس پر طرفہ تماشا یہ تھا کہ میں تہلکہ سے جڑی صحافی تھی جس کے صحافیوں کے بارے میں تقریباً یہی گمان رکھا جاتا تھا کہ ہر وقت خفیہ کیمرے سے لیس ہوتے ہوں گے۔

اگرچہ میں نے جو کچھ گجرات میں پایا وہ محض گجرات کا مسئلہ نہیں ہے۔ ایمان دار

پولیس افسران کے خلاف کارروائی اتر پردیش اور منی پور میں بھی روزمرہ کا معمول ہے۔ میں ان دونوں ریاستوں میں خوب رپورٹنگ کر چکی ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ کارروائی کا یہی پہلو میرے لیے راہ نجات بنے گا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس افسر نے سب سے زیادہ مجرم ٹھہرانے والے بعض نوٹس اور رپورٹیں مجھے دیں وہ اس افسر کا بیچ میٹ (batchmate) نکلا جس کے بارے میں میں نے رپورٹنگ کی تھی۔ یہی اتفاق بات آگے بڑھانے کا سبب بھی بنا۔ حقوق انسانی کے میدان میں کام کرنے والے کارکنان کے تعاون اور افسروں کے ذریعے مہیا کردہ ثبوتوں کی مدد سے میں نے اس سال کا سب سے سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔ ان کال ریکارڈوں کا تعلق اس وقت کے ریاستی وزیر برائے امور داخلہ امت شاہ اور انکاؤنٹروں کے دوران تعینات اعلیٰ افسران سے تھا۔ کال ریکارڈوں کے ساتھ آفیشیل سیکریٹ ایکٹ کا ایک تنقیدی نوٹ بھی ساتھ میں تھا۔ وزیر موصوف کی نقل و حرکت پر ریاستی سی آئی ڈی کی مستقل نظر تھی اور نوٹ میں الزام لگایا گیا تھا کہ انکاؤنٹر ایک گھناؤنی سازش کا حصہ تھا جس کا مقصد بے قصوروں کو قتل کر کے ان پر دہشت گرد ہونے کا الزام لگانا تھا۔

اس انکشاف نے سیاسی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ سی بی آئی سے تہلکہ کے آفس میں فون آنے لگے۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ سب ریکارڈس جو بعد میں سپریم کورٹ کے سامنے پیش کیے گئے ان کے حوالے کیے جائیں۔ میں بدستور احمد آباد کے ایمبسڈر ہوٹل میں قیام پذیر رہی جو اب تک میرے لیے دوسرے گھر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہ ہوٹل نسبتاً مسلم آبادی والے علاقے خان پور میں واقع تھا۔ یہ جگہ میرے ٹھہرنے کے لحاظ سے سیدھی سادی سی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ بی جے پی کا ریاستی دفتر وہاں سے بس تھوڑی ہی دوری پر واقع ہے۔ میں اچانک عوام کی نظروں میں آ چکی تھی۔ بی جے پی کے لیڈر کسی ایوب نامی نوجوان کے بارے میں باتیں کرتے تھے کہ انکشاف اس نے کیا ہے۔ کسی وجہ سے ایک خاتون تفتیشی صحافی کا تصور ان کے ذہن میں نہیں

آیا تھا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ اس سے مجھے آسانی ہو گئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر سکوں۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل پایا۔ انکشاف کے چند دنوں کے بعد ہی میرے فون پر کسی گمنام نمبر سے ایک پیغام موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا: 'ہم جانتے ہیں کہ تم کہاں ہو۔'

زندگی میں اچانک اتھل پتھل پیدا ہو گئی۔ اس دن کے بعد سے میں ہر تیسرے دن اپنی قیام گاہ بدلنے لگی۔ کبھی احمد آباد میں موجود انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کے کیمپس میں تو کبھی گیسٹ ہاؤس، ہاسٹل اور جم خانوں میں۔ میں ایک فرار مجرم کی طرح اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب لینڈ لائن کی جگہ میرے پاس موبائل فون ہوا کرتا تھا۔ آخر کار جتنے ثبوت میں اکٹھا کر چکی تھی وہ سب سی بی آئی کے حوالہ کرنے اور اپنی مزید تفتیشی رپورٹیں تیار کرنے کے بعد میں ممبئی واپس آئی کہ معمولاتِ زندگی کی طرف لوٹا جائے۔

لیکن قسمت میرے لیے کچھ اور چاہتی تھی۔ انکشاف کے چند ہفتوں کے بعد ہی سی بی آئی نے امت شاہ کو گرفتار کر لیا۔ آزاد بھارت کی تاریخ میں کسی بھی برسر خدمت وزیر داخلہ کی گرفتاری کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ راتوں رات یہ ایک سنسنی خیز معاملہ بن گیا۔ قومی سطح کی میڈیا کے اکثر افراد گاندھی نگر میں واقع سی بی آئی ہیڈ کوارٹرز کے باہر ڈیرہ جمائے تھے۔ حسب توقع مجھے گجرات لوٹ کر اس سنسنی خیز گرفتاری کے بعد رونما ہونے والی پیش رفت پر رپورٹ کرنی پڑی۔

شاہ کی گرفتاری نے ان افسروں کو نئی زندگی عطا کر دی تھی جنھیں اس کے دور میں بھید بھاؤ کے رویے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب افسر اپنے نبض شناسوں کو یہ کہہ کر میرے پاس بھیجنے لگے کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ جو پہلے صحافیوں سے کتراتے تھے اب ان میں بھی بولنے کی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ زیادہ تر گفتگو اگرچہ ریکارڈ کی نوعیت کی نہیں ہوتی تھی لیکن ایک بات صاف تھی کہ انکاؤنٹر کے معاملے تو محض برفیلے تودے کا سرا تھے۔ وہاں کچھ ایسا تھا جو اور بھی بھیانک اور گھناؤنا تھا اور مختلف معاملات

سے متعلق فائلوں میں دفن تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی حقیقت کے آس پاس بھی نہیں تھا۔ البتہ یہ اشارہ موجود تھا کہ گزشتہ ایک دہائی کے دوران عدالتی طرز عمل کی دھارا بدل دی گئی تھی۔ جو انسانی جانوں کی حفاظت پر مامور تھے انھیں خرید لیا گیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات سے لے کر انکاؤنٹر اور سیاسی قتل وغارت گری کے معاملات تک بہت سے تکلیف دہ حقائق کو سامنے آنا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ان میں سے کسی بھی بات کو ثابت کیسے کیا جائے؟

شواہد کا حصول صحافت کا بنیادی قاعدہ ہے اور میرے پاس وہی نہیں تھے۔ صرف کچھ گفتگوئیں، تبصرے اور ریکارڈ سے پرے اعترافات کا پلندہ تھا۔ بھلا ان باتوں کو میں ثابت کیسے کر پاؤں گی؟ تبھی میں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو میری زندگی کو بدلنے والا تھا، ذاتی طور پر بھی اور پیشہ ورانہ طور پر بھی۔ رعنا ایوب کو میتھلی تیاگی کی زندگی جینی تھی۔ کانپور سے تعلق رکھنے والی ایک کایستھ لڑکی، امریکن فلم انسٹی ٹیوٹ کانزرویٹری کی طالبہ جو گجرات کے ترقیاتی ماڈل اور پوری دنیا میں بسنے والے غیر مقیم بھارتیوں کے درمیان بڑھتی ہوئی نریندر مودی کی مقبولیت پر ایک فلم بنانے کے لیے بھارت لوٹی تھی۔



باب دوم

اپنے اعلیٰ ذمہ داروں کو ای میل کرنا اور پھر ان کی جانب سے مزید گہرائی سے تحقیقات کرنے کی بابت مثبت جواب موصول ہونا کافی تھا کہ میں اس سلسلے میں غور و فکر شروع کر دوں۔ تقریباً تین مہینے گجرات میں گزارنے کے بعد اور جن حالات میں ان لوگوں سے ملی تھی اور جو معلومات فراہم کرنے کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار کر چکے تھے اس سے اس بات کا کافی اشارہ مل چکا تھا کہ آگے کا راستہ خاصا مشکل ثابت ہوگا۔ قوت پر قابض افراد سے سچائی اگلوانا جنھوں نے اپنی ذات کے اندر ہی حقیقت کو سر بمہر رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے رفیق کار آشیش کھیتان نے اپنے انکشاف میں بعض خوف ناک حقائق کو بے نقاب کیا تھا۔ اس انکشاف میں انھوں نے بابو بجرنگی اور اس جیسے دیگر بی جے پی اور وی ایچ پی لیڈروں کے منہ سے ۲۰۰۲ء کے فسادات کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی روداد خفیہ طریقہ سے ریکارڈ کی تھی۔ لیکن میرا کام ان بلوائیوں کے خلاف ثبوت اکٹھا کرنا نہیں تھا جو ان کو اکساتے ہی اپنی بہادری کے قصے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میرا پالا ان پختہ کار اعلیٰ پولیس افسروں سے پڑنے والا تھا جن میں سے اکثر را اور آئی اینڈ بی جیسے حساس اداروں میں کامیابی سے اپنی خدمات کی مدتیں پوری کر چکے تھے۔

یہ سب کے سب موٹی چمڑی والے اپلچی تھے، ان کا منہ کھلوانے کے لیے اختیار و اقتدار سے بس ایک لائق اور ماہر تفتیش کار کی صلاحیتیں درکار تھیں۔ ان میں سے کسی بھی خصوصیت کے لیے میں خود کو اہل نہیں سمجھتی تھی۔ منصوبہ بندی کے علاوہ اس کے نفاذ کی ذمہ داری بھی

مکمل طور پر میرے اوپر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے آفس کے کسی ماتحت کا انتخاب اس کام کے لیے میں نہیں کر سکتی کیوں کہ ایسا کرنا اضافی خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ واضح طور پر مجھے بتادیا گیا تھا کہ میرے ایڈیٹر میرے کام کی نگرانی تو کریں گے لیکن اس کے علاوہ بقیہ تمام قسم کی ذمہ داریوں کا بوجھ مجھے خود ہی سنبھالنا ہو گا۔ ہر بار جب میں کوئی مسودہ بھیجتی شوما اور ترون دونوں کی جانب سے مجھے حوصلہ بخش جوابات موصول ہوتے۔ یہ جواب 'زبردست، اس کام کو جاری رکھو' یا 'چشم کشا انکشاف' جیسے الفاظ پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایسی باتوں سے جہاں مجھے مزید تفتیش کے لیے حوصلہ ملتا وہیں یہ بھی سچ تھا کہ میدان میں میں ایک تنہا سپاہی تھی۔ مجھے اپنا خیال خود رکھنا تھا اور اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ تفتیش کے ذریعے دیانت دارانہ اور شواہد پر مبنی نتائج بر آمد ہوں۔

بعض ایسے لوگ موجود تھے جو حقیقت سے باخبر تھے اور انھوں نے اس کے ساتھ جینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ زندگی ایسے گزار رہے تھے گویا ۲۰۰۲ء کی سیاسی خوں ریزی کبھی ان کے کیریئر کا حصہ نہ رہی ہو۔ تہلکہ جیسے تفتیشی ادارے کی صحافی کی حیثیت سے میں یہ جانتی تھی کہ ہر وہ دروازہ جہاں سے مدد حاصل ہو سکتی تھی میرے لیے بند تھا۔ میرے سامنے بس ایک ہی راستہ بچ گیا تھا جس کا استعمال سچائی کی تلاش میں سر گرداں ہر صحافی آخری چارۂ کار کے طور پر کرتا ہے یعنی انڈر کوَر ہو جانا۔ میں محض ۲۶ برس کی تھی، ایک لڑکی، وہ بھی مسلمان۔ اپنے تشخص کے سلسلے میں میں کبھی بھی پُر خیال نہیں رہی۔ لیکن جب معاملہ ایسی ریاست کا ہو جو مذہبی خطوط پر بنٹا ہوا ہو تو ان باتوں کا بڑے محتاط انداز میں خیال رکھنا ضروری تھا۔ مجھے اپنے گھر والوں کو بتانا ضروری تھا کہ میری شناخت کیا ہو گی؟ کیا کسی تعاون کے بغیر میں یہ کام کر پاؤں گی؟

میرا ایک معروف ماس کمیونی کیشن کورس کرنا ایسے موقع پر کام آیا۔ میرے ہم جماعتوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو اداکار بننے کا شوق رکھتے تھے اور فلم انڈسٹری میں انھوں نے اپنی ایک پہچان بنالی تھی۔ اداکارہ رِچا چڈھا جو میری ہم جماعت رہ چکی تھی اور اب ایک

بہترین اداکارہ بن چکی ہے اس نے حال ہی میں اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس نے بطور صحافی میرے کیریئر گراف اور تجربات کا انتخاب ایک فلم کی تیاری کے لیے کیا تھا جس میں اس کو ایک رپورٹر کا کردار ادا کرنا تھا۔ ایسی ہی ایک دیرینہ ملاقات والی فون کال میں نے ایک دوسرے قریبی اداکار دوست کو کی۔ اس کی مدد سے اس کے میک اَپ مین سے ملنے کا وقت لیا۔ دوسرے دن ممبئی کے نواح میں واقع ایک اسٹوڈیو میں چائے کی چسکیوں کے ساتھ اپنے لیے مناسب بناوٹی بال (وِگ) حاصل کرنے کی تکنیکی باریکیاں سیکھ رہی تھی۔ میک اَپ آرٹسٹ، جو ایک تجربہ کار بزرگ نکلے۔ انھوں نے اپنے اسٹاک میں موجود ذخیرے میں سے میرے اوپر کچھ وِگ آزمائے۔ وِگ لگانے سے میرا حلیہ تو الگ نظر آنے لگا، لیکن کچھ ایسا تھا جو مصنوعی اور غیر موزوں محسوس ہو رہا تھا۔ وِگ کے ذریعہ حلیہ بدلنے کا خیال موزوں نہیں لگا اس لیے اسے ترک کر دیا۔

مجھے خیال آیا کہ اس سے بہتر یہ ہو گا کہ مکمل طور پر اپنی شناخت ہی بدل لی جائے۔ اتفاق سے اپنے سابق ہم جماعتوں کے ایک گروپ میں مجھے ایک ایسے رفیق کار کا ای میل پتہ مل گیا جس نے لاس اینجلس کے باوقار ادارے امیریکن فلم انسٹی ٹیوٹ کانزرویٹری میں داخلہ لیا تھا۔ ایسا لگا جیسے مجھے میری منزل مل گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میری شناخت بس یہی ہو گی۔ ایک فلم ساز جو امریکہ سے گجرات ایک خاص قسم کی فلم بنانے آئی ہے۔ یہ خیال تو امید افزا تھا لیکن اس کی کامیابی کا امکان کتنا تھا؟

اگلے چند دن میں نے کانزرویٹری کے کام، اس کے فارغین، اس کی فلمیں خصوصاً گجرات پر بنائی گئی اس کی فلموں اور ان میں اٹھائے گئے موضوعات کو سمجھنے میں صرف کیے۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں فلم کے موضوع کو کھلا چھوڑ دوں گی جس کا انحصار میری بغیر اسکرپٹ کی اسٹوری کے کرداروں کے رد عمل پر منحصر ہو گا۔ مجھے فلم کے لیے ایک نام سوچنا تھا جو پر جوش، روایتی اور اپنے موضوع کی مناسبت سے موزوں ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ فلموں کے شوق سے مجھے بہت مدد ملی۔ مجھے ہندی فلمیں دیکھنا پسند ہے اور ایسی ہی ایک فلم جس کے بارے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کبھی دیکھی تھی وہ راج کمار سنتوشی کی فلم لجّا ہے۔ دلی سے ممبئی جانے والی پرواز کے دوران مجھے اس فلم کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ عورتوں کے مضبوط کردار اس فلم کی جان تھے۔ مادھوری دیکشت، منیشا کوئرالہ سمیت تمام کرداروں نے زبردست طریقے سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس فلم میں کوئرالا نے 'میتھلی' نامی عورت کا کردار ادا کیا تھا جو جنس اور ذات کی بنیاد پر ظلم کی چکّی میں پسنے والی بھارتی عورتوں کی زندگیوں کا حال جاننے کے لیے ملک کے طول و عرض میں سرگرداں رہتی ہے۔ سری رام کی بیوی سیتا کا نام بھی میتھلی تھا۔ اس نام کی کشش نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جب میں دوسرے کسی ایسے نام کی تلاش میں لگی ہوئی تھی جو عوام میں مانوس بھی ہو اور سماجی اونچ نیچ سے جڑے القاب سے قدرے مختلف بھی ہو یعنی نہ تو برہمن طبقے کی عکاسی کرتا ہو اور نہ ہی دلت طبقے کی۔ تبھی 'میتھلی تیاگی' کا جنم ہوا۔ میرے وزٹنگ کارڈ پر لکھا تھا میتھلی تیاگی، آزاد فلم ساز، امریکن فلم انسٹی ٹیوٹ کانزرویٹری۔

لیکن قبل اس کے کہ میں دوبارہ گجرات کے سفر پر روانہ ہوتی مجھے ایک لائق معاون کی ضرورت تھی جو مجھے جلد ہی مل گیا اور جس کی موجودگی نے میری زندگی پر ایک گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ شخص مائیک تھا (نام بدل دیا گیا)۔ مائیک فرانس میں سائنس کا طالب علم تھا جو بھارت میں طلبا کے تبادلہ پروگرام کے تحت آیا تھا۔ مائیک کی خواہش تھی کہ بھارتی صحافیوں کے ساتھ اس کو کام کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے اس کو ای میل بھیجا جس میں اسے اپنی آئندہ تفتیش کی باریک تفصیلات دینے سے گریز کیا تاہم جتنا ممکن ہو سکتا تھا دیانت داری سے کام لیا۔

میں نے اُسے بتایا کہ مجھے ایک ایسے غیر بھارتی رفیق کار کی ضرورت ہے جو میرے ساتھ ایک فلم پر کام کرنے کا ڈھونگ رچ سکے۔ اس کے علاوہ میں نے اُسے اس بات سے بھی

آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ایک بڑی اور انتہائی حساس تفتیش کا حصہ ہو گا۔ البتہ میں نے اسے متنبہ کر دیا کہ نازک تفصیلات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہو گا۔ وہ ایک 'فرنگی گورا' ہو گا جس کا کام میری شناخت کو تقویت دینا ہے اور بس۔

وزٹنگ کارڈ، ایک جوڑا سرمئی لینز، بال سیدھا کرنے والی مشین، رنگ برنگے رومال اور کچھ ریکارڈنگ کے آلات سے لیس ہو کر میں احمد آباد پہنچ گئی۔ مائیک کو چند دن کے بعد آنا تھا۔ سب سے پہلے میں نے میتھلی تیاگی کے نام پر ایک سم کارڈ حاصل کر لیا۔ احمد آباد میں میرے نام نہاد 'فیملی گارجین' کے ذریعے مہیا کردہ دستاویزات کی مدد سے جس آسانی کے ساتھ مجھے سم کارڈ مل گیا تھا اس پر مجھے حیرانی بھی ہوئی تھی۔ تفتیش کے لیے طویل وقت درکار تھا۔ کسی شان دار ہوٹل میں اپنے قیام کا بار نہ تو میں اٹھا سکتی تھی اور نہ میرا ادارہ۔ مزید یہ کہ میں ایک ایسے فلم ساز کا کردار نبھا رہی تھی جو جدوجہد کے دور سے گزر رہا ہے اور جس کے مالی وسائل محدود ہیں۔ ایسے شخص کے قیام کا انتظام کوئی مقامی ہی کر سکتا ہے۔ اس موقع پر ایک فن کار دوست کی مدد کام آئی جو احمد آباد کے ادبی اور کلچرل حلقوں میں معروف تھا۔ اس کی مہربانی یہ ہوئی کہ اس نے مجھ سے زیادہ سوالات نہیں کیے۔ ان کے لیے یہ جاننا کافی تھا کہ میں ایک صحافی ہوں جس کی تفتیش کے نتیجے میں وزیر داخلہ کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ انھوں نے اپنے رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے نہرو فاؤنڈیشن نامی تعلیمی ادارے میں مجھے قیام کی جگہ دلوا دی۔

فاؤنڈیشن میں ہاسٹل کے نگران سے میرا تعارف بطور فلم ساز کرایا گیا۔ اس نے بمشکل ایک اچٹتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور پھر میرے دوست کے ساتھ، جو میری مدد کر رہے تھے، محو گفتگو ہو گئے۔ مجھے ۲۵۰ مربع فٹ کا کمرہ جس سے متصل ہی غسل خانہ بھی تھا ۲۵۰ روپے یومیہ کی در سے حاصل کرنے میں کامیابی مل گئی تھی۔ ہاسٹل میں مقیم رفقا نے میری تفتیش کے عمل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ سب یورپ کے مختلف حصوں مثلاً جرمنی،

گرین لینڈ اور لندن سے آئے ہوئے طلباء وطالبات تھے۔

میری پہلی شناسائی مانک بھائی (نام بدل دیا گیا) سے ہوئی۔ یہ ہاسٹل کے منیجر یا ڈین تھے۔ میرے دوست نے ان سے میرا تعارف یہ کہتے ہوئے کروایا تھا کہ میڈم یہاں گجرات پر ایک فلم بنانے آئی ہیں۔ 'ارے بہت اچھا۔' مانک بھائی نے جواباً کہا۔ 'ہمارے گجرات اور وزیر اعلیٰ صاحب کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتایئے گا۔ یہ احمد آباد شہر بہت ہی خوب صورت ہے۔' یہ بات کہتے کہتے انھوں نے ایک ہی سانس میں یہ پیشکش بھی کر دی تھی کہ شہر کی سیر کروانے مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میرے کمرے میں ایک سنگل بیڈ، رائٹنگ ٹیبل اور کتاب کی الماری کے لیے ہی جگہ کافی ہو سکتی تھی البتہ ہاسٹل کا جائے وقوع ایسا تھا کہ جگہ کی تنگی کی تلافی ہو گئی۔ یہ ہاسٹل جو گجرات کے سب سے مہنگے اور مرکزی علاقوں میں سے ایک حصے میں واقع تھا، اگلے چھ مہینوں تک میرے لیے گھر سے دور گھر کا کام دینے والا تھا۔

دوسری ہی صبح مائیک آ گیا، ایک ذہین طویل قامت فرانسیسی نوجوان جس کی عمر صرف ۱۹ برس تھی اور پراگندہ بال رکھتا تھا۔ ہاسٹل میں آنے سے قبل اس سے میری ملاقات میرے اس دوست کے گھر پر ہوئی تھی جہاں میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کا رول کیا ہو گا۔

مانک بھائی نے ازراہ مہربانی ایک مہینے کے لیے مائیک کو میرے کمرے سے متصل ہی ایک کمرہ دے دیا۔ شاید مائیک کا انھیں 'کیم چھو' کہہ کر متاثر کرنا کام آ گیا تھا۔ مائیک کے اندر سیکھنے کی لگن تھی۔ اسے مختلف ثقافتوں کے بارے میں جاننے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کی خاص دل چسپی کھانے میں تھی۔ اس شام ہمارا پہلا کھانا احمد آباد کے مشہور مقامی جوائنٹ پر تھا جو پکوان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس پر لطف واقعہ کو مائیک اور میں اب بھی یاد کرتے ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ کم سے کم دو درجن پوریاں اور حلوے کے نصف درجن پیالے چٹ کر گیا تھا۔

کھانا کھا کر جب ہم ہاسٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اس نے مجھ سے پوچھا: 'جب ہم

اکیلے ہوں تو کیا میں آپ کو رعنا کہہ کر پکار سکتا ہوں؟'نہیں، جب تک تم اس ملک سے چلے نہ جاؤ میں تمہارے لیے صرف میتھلی ہی رہوں گی۔' مائیک نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا۔ پیرس روانگی سے ایک روز قبل جو الوداعی کارڈ اس نے میرے لیے چھوڑا اس پر ہندی میں اس نے لکھا تھا: 'پیاری میتھلی، اپنا خیال رکھنا۔مائیک۔'

ابتدائی چند ایام نہرو فاؤنڈیشن میں اپنے نئے معمولات سے ہم آہنگ ہونے میں صرف ہوئے۔مائیک اپنے کمرے میں فرنچ ہندی لغت لے کر بیٹھ جاتا اور مجھ سے سوالات کرتا جاتا اور ساتھ ہی مارک ٹلی کی ایک کتاب بھی پڑھتا جاتا تھا۔اپنی عمر کے حساب سے مائیک بڑا وسیع المطالعہ، صائب الرائے اور تجزیاتی ذہن کا حامل تھا۔وہ چیزوں کی گہرائی تک بہت جلد پہنچ جاتا تھا۔فاؤنڈیشن کے احاطے میں ایک کینٹین تھی جہاں ۲۵/روپے میں کھانا مل جاتا تھا۔وہاں سے خم دار سیڑھیاں اور انسٹی ٹیوٹ کی چھت دکھائی دیتی تھی جس کے آگے جنگل کا دل فریب منظر تھا۔ ہر روز دوپہر کو ہم لوگ چھت پر چلے جاتے، وہاں کھانا کھاتے اور کام بھی کرتے رہتے۔مائیک مجھ سے پوچھتا: 'تو بتاؤ میتھلی۔ منصوبہ کیا ہے؟ ہم کس سے ملنے والے ہیں؟' اور میں ایک ہی جواب دہراتی: 'جب صحیح وقت آئے گا میں تمہیں بتا دوں گی۔'

شام کے وقت مائیک اور میں اپنے کیمرے نکالتے اور پرانے شہر میں تصویریں کھینچنے کے لیے نکل پڑتے۔ ہم دونوں میں جو ایک قدر مشترک تھی وہ یہ کہ ہم دونوں فوٹو گرافی بہت پسند کرتے تھے اور دونوں کے پاس ایک جیسے ایس ایل آر کیمرے تھے۔البتہ ہمارا روز کا نکلنا فوٹو گرافی کے شوق کے تحت نہیں تھا۔ بلکہ ایسا ہم صرف اس لیے کرتے تھے کہ جو کردار ہم نے اپنے لیے منتخب کیے تھے انھیں حقیقت سے قریب رکھنے میں تقویت مل سکے اور جو کوئی بھی ہمیں دیکھ رہا ہو اسے یقین آجائے۔ اگر ہم اعلیٰ عہدوں پر فائز افسروں سے رابطہ قائم کریں گے تو لازمی طور پر ہمارے پس منظر سے متعلق تفصیلات جاننے کی کوشش کی جائے گی۔بالخصوص اس جگہ پر جہاں ہم مقیم تھے ہمارے لیے یہ ضروری تھا کہ احمد آباد میں

ہمارا ایک سماجی حلقہ ہو جو ہماری شناخت کی تصدیق کر سکے۔

مشہور فن کار ایم ایف حسین کے ذریعے قائم کردہ تاریخی آرٹ میوزیم، آمداواد نی گپھا ہمارے لیے بڑا مددگار ثابت ہوا۔ میوزیم ایک وسیع و عریض پارک میں واقع ہے۔ وہاں ایک کیفے ہے جہاں نوجوانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جن میں بیشتر آرٹسٹ اور فوٹوگرافر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی گٹار بجا رہا ہوتا ہے تو کوئی اپنے کام کی تشہیر میں مصروف رہتا ہے۔ فلم سازی، فوٹوگرافی اور تھیئٹر میں کام کرنے کے متمنی افراد بھی یہاں مل جاتے ہیں۔ بطور میتھلی مجھے یہاں وقت گزارنے میں بہت لطف آتا تھا۔ یہی حال مائیک کا بھی تھا۔

مائیک کو لال دروازہ پسند تھا۔ یہ پرانے گجرات کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہر جمعرات کو وہاں ایک کھلا بازار لگتا تھا۔ اس کے علاوہ پتنگ بنانے والے اور کمہار بھی اس علاقے میں رہتے تھے۔ وہ شام کو اپنے ساتھ کچھ شان دار تصویریں لے کر واپس لوٹتا تو اپنا پسندیدہ سوال دہراتا: 'آج رات ہم کھانا کہاں کھائیں گے؟' وہ کھانے کا شوقین تھا اور گجرات اس کے لیے بالکل مناسب جگہ تھی۔

دریں اثنا ایک ایکٹیوسٹ دوست سے موصول ای میل کی شکل میں مدد آگئی۔ افسروں کے ساتھ بہرحال میرا رابطہ قائم کرنا ضروری تھا اور میری فہرست میں پہلا نام جی ایل سنگھل کا تھا جو اس دوران گجرات اے ٹی ایس کے حقیقی سربراہ کے عہدے پر فائز تھا۔ عشرت جہاں 'فرضی' انکاؤنٹر (۱) معاملہ میں اس کے رول کے بارے میں تفتیش جاری تھی۔ اپنے صحافتی اور افسر دوستوں کے ساتھ اپنی تحقیقات کے دوران جو مواد میں نے جمع کیا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خود کو الگ تھلگ کر لیا تھا اور اس کے چند ہی دوست رہ گئے تھے۔ میڈیا کو قطعاً وقت نہیں دیتا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ تقریباً ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ تو بھلا کوئی اس تک رسائی کیسے کرے؟

ای میل میں نریش اور ہیتو کنوڈیا سے متعلق تفصیلات موجود تھیں۔ یہ دونوں گجرات

فلم انڈسٹری کے مشہور ایکٹر ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نریش کنوڈیا گجراتی فلم انڈسٹری کے امتابھ بچن کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ہیتو جنوبی ممبئی سے تعلیم یافتہ ان کا بیٹا تھا جس نے عقل مندی اسی میں سمجھی کہ ہندی فلم انڈسٹری میں موقع پانے کا انتظار کرنے کے بجائے باپ کے نقش قدم پر ہی چلا جائے۔

مجھے ای میل میں بتایا گیا تھا کہ کنوڈیا کا تعلق پس ماندہ طبقے سے ہے اور ان کی جان پہچان اعلیٰ افسروں، بشمول سنگھل، سے خوب ہے۔ میں بہت خوش ہوئی اور نریش کنوڈیا کو کال کیا جس نے مجھے اگلی صبح احمد آباد کے جم خانے میں آنے کے لیے کہا۔ جب میں اسے ملی تو یہ ملاقات کچھ خاص مفید نہیں رہی۔ میرے خوب مشق کردہ امریکی لہجے کے رد عمل میں اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ وہ آئینہ دیکھنے کے لیے مڑا اور اپنے بالوں میں کنگھی پھیرنے لگا پھر لاپروائی سے بولا: 'بین، ہندی میں بولونا اور تھوڑا آہستے بولو، بہوت فاسٹ ہو تم۔'

واضح طور پر میں نے اپنی تیاری صحیح طریقے سے نہیں کی تھی۔ اگلے ایک گھنٹے تک میں اسے اپنی فلم کے موضوع کے بارے میں سمجھاتی رہی۔ میں نے بتایا کہ میں ایسی فلم بنانا چاہتی ہوں جس میں گجرات کے وہ پہلو جن پر عموماً نظر کم جاتی ہے دکھائے جائیں۔ مثلاً گجراتی فلم انڈسٹری اور کس طرح پس ماندہ طبقوں کے لوگوں نے اس صنعت میں ترقی کی ہے۔ اب اس کی آنکھوں میں ایک چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو خود کو 'اسٹار' سمجھتا تھا اور جس کی کامیابی اس کی اپنی ریاست میں ہندی فلموں کے باعث ماند پڑنے لگی تھی، ایک 'ولایتی' فلم ساز کے ذریعے اس کام کی تحسین کے موقعے نے آخر اپنا مطلوبہ اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے دن مجھے گاڑی چلا کر ۱۰۰/ کلو میٹر دور ایک گاؤں میں پہنچنا تھا جہاں کنوڈیا مجھے انٹرویو دینا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ فلم کے سیٹ پر ان کے کرتب بھی دیکھوں۔ ان سے ملاقات کے بعد جب میں واپس اپنے کمرے میں لوٹی تو بستر پر بیٹھ کر دیر

تک اس پورے عمل کی بے سودگی کے بارے میں سوچتی رہی۔ سردست جو موقع تھا اس میں خطرہ تو بہت تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ دوسری صبح ایس ایل آر اور نوٹس سے لیس ہو کر میں جب اپنے کمرے سے جب باہر نکلی تو مائیک نے مجھے روکتے ہوئے کہا: 'آپ نے آنکھوں میں لینس نہیں لگائے ہیں۔' میں ابھی تک اپنے نئے اوتار کی عادی نہیں ہو پائی تھی۔

فلم کا سیٹ شہر کے نواح میں ایک گاؤں میں تیار کیا گیا تھا جسے دیکھنے کے لیے ہزاروں کی بھیڑ امڈ پڑی تھی۔ کنوڈیا کا بیٹا ہیتو، جو جنوبی ممبئی کا ایک خوش پوشاک گریجویٹ تھا، ایک قیدی کے لباس میں تھا اور اس کا باپ ایک پولیس افسر کا کردار ادا کر رہا تھا۔

فلم کی شوٹنگ دیکھنے کے لیے مجھے ایک کرسی دے دی گئی۔ میں بڑی محنت سے نوٹس اور فوٹو لیتی جا رہی تھی۔ میں نے غور کیا کہ فوٹوگرافی کرنے والی میں وہاں اکیلی نہیں تھی۔ ایک اور نوجوان جو عمر کی تیسری دہائی میں ہو گا ٹرائی پوڈ اور کیمرہ لے کر اس موقعے کی اہم تصویریں اتارنے میں محو تھا۔ یہ بات بھی صاف تھی کہ وہ فلم یونٹ کا حصہ نہیں تھا۔ جب کنوڈیا نے اس کا تعارف ہم سے بطور ڈاکیومنٹری فوٹوگرافر کروایا تو اس نے مائیک اور مجھے لاپرواہی سے دیکھا اور پھر اپنے فریم پر کام کرنے میں مشغول رہا۔ یہ فوٹوگرافر اجے پنجوانی (نام بدل دیا گیا) تھا جس کے ساتھ آئندہ مہینوں میں ایک عجیب تعلق پیدا ہونے والا تھا، ایک ایسی دوستی جو میری اصل شناخت کے ساتھ کبھی ممکن نہ ہوتی۔ اس دوستی کی بنیاد اگرچہ فریب پر قائم تھی لیکن میتھلی کو اس کی ضرورت تھی۔

اگلے چند دن کنوڈیا کے سیٹ پر آنے جانے میں گزرے، جہاں 'یونٹ کی چائے' پر فلم کے باریک فنی پہلوؤں پر گفتگو ہوتی۔

اجے جو اپنی ڈاکیومنٹری کے سلسلے میں گجراتی فلموں کے سیٹ پر پابندی سے آتا تھا آخر کار ہم سے کھل گیا اور کچھ دنوں بعد یہ پیشکش بھی کر دی کہ بوقت ضرورت ہم سے

تعاون کرے گا۔ سیٹ کی انہی ملاقاتوں کے دوران ایک دن میں نے موقع دیکھ کر گجرات کے مشہور پولیس افسروں سے ملاقات کرنے موضوع چھیڑ دیا۔ خاص طور سے وہ افسر جن کا تعلق پسماندہ طبقوں سے تھا۔ میں نے کنوڈیا سے کہا کہ اگر کوئی ایسا افسر ہو جو کسی حساس عہدے پر فائز ہو تو اس سے مدد مل سکتی ہے۔ بالخصوص ایسا عہدہ جس میں بہادری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہو اور دہشت گردی کے خلاف گجرات کی سیکوریٹی میں بھی اس کا کچھ عمل دخل ہو۔

اس آخری جملے کا وہی نتیجہ نکلا جو مطلوب تھا۔ اس نے کہا: 'آپ کو مسٹر سنگھل سے ملنا چاہیے۔ وہ ہمارے بہترین افسروں میں سے ایک ہے جس نے بہت سے دہشت گردوں کو ختم کیا ہے۔' میں نے اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کی اور اس کا نام یوں لکھنے لگی جیسے پہلی بار اس کے بارے میں سن رہی ہوں۔

میں نے کمال بھولے پن سے پوچھا: 'سر، یہ افسر سنگھل کیا کرتے ہیں؟ وہ کہاں کام کرتے ہیں؟' مجھے اپنے فلمی دوستوں سے بس یہی تو چاہیے تھا۔ اینٹری کا ایک ایسا موقع جس سے افسروں کو مجھ پر شک نہ گزرے۔ ظاہر ہے آخری شخص جس پر سنگھل کو شک ہو سکتا ہے وہ ہو گا جو خود ایک فلم ساز ہو اور جو علاقائی فلموں سے جڑے ایک اعلیٰ ترین فلم ساز کے توسط سے اس سے ملاقات کرے۔

تقریباً ٹھیک اسی وقت احمد آباد میں موجود میرے ایک وسیلے نے، جسے میں درکار مدد کے سلسلے میں بتایا تھا، مجھے دوسرا ای میل ارسال کیا۔ اس ای میل میں شہر کے ایک معروف امراض نسواں کے ماہر (گائنی کولوجسٹ) ڈاکٹر سے رابطے کی تفصیلات درج تھیں جن کا نام یہاں نہیں لیا جائے گا۔

جب بھی میں اپنے کمرے میں ہوتی میرا یونی نور (موبائل) نیٹ ورک مجھ پر مہربان نہیں رہتا تھا۔ اس لیے اکثر مجھے چھت پر جانا پڑتا تھا جہاں ہاسٹل کے لوگ چائے یا سگریٹ کا شوق پورا کرنے کے لیے موجود رہتے تھے۔ مائیک بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ اس دن میں

نے گائنی کولوجسٹ کو چھت سے فون کیا اور بطور فلم ساز اپنا تعارف کرایا جو گجرات پر ایک فلم بنانا چاہتی ہے اور صحت کے سیکٹر کا بھی فلم میں احاطہ کرنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر ایک ملنسار شخص نکلا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس شام میں اس کے اسپتال آسکتی ہوں؟ مجھے بھلا کیا چاہیے تھا۔ اس ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے نکلنے ہی والی تھی کہ مائیک دوڑتا ہوا آیا، 'میتھلی، کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟' وہ بولا: 'میتھلی میں اس طرح کام نہیں کر سکتا۔ جس سے بھی ہم ملتے ہیں آپ ان سے کہتی ہیں کہ آپ ایک فلم بنا رہی ہیں۔ لیکن میں تو آپ کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ آپ کو پوری سچائی مجھے بتانی چاہیے۔' میں نے مائیک کے تجسس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ مصر ہو چکا تھا اور شاید اس کو ٹھیس بھی پہنچی تھی۔ 'میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ یہ آپ جانتی ہیں۔ میں بہت مطالعہ کرتا ہوں، تعلیمی تبادلہ پروگرام کے تحت یہاں آیا ہوں۔ اس لیے آیا ہوں کیوں کہ میں نے زندگی میں کچھ حاصل کیا ہے۔ آپ کو سب کچھ مجھے بتانا چاہیے۔ کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے؟ یا آپ کے لیے میں بس ایک غیر ملکی چہرہ ہوں جس کی آپ صرف نمائش کرنا چاہتی ہیں، کسی اضافی شے کی طرح؟' مجھے لگا کہ اس نے بڑی مشق کے بعد یہ باتیں کہی ہیں۔ لیکن اس کی خفگی میں کچھ تو بات تھی کہ میں اصل تفتیش کی تفصیلات کے سلسلے میں اسے شریک راز کرنے کے لیے راضی ہوگئی۔ میٹنگ کے لیے نکلنے سے قبل میں نے اپنی سابقہ اسٹوریوں کے کچھ لنک اس کو بھیج دیے اور تاکید کر دی کہ ان اسٹوریوں کو وہ پڑھ لے تاکہ شام کو جب میں لوٹ کر آؤں تو حالیہ تفتیش کا پورا پس منظر اس کو معلوم ہو۔

ڈاکٹر کے ساتھ میری میٹنگ نہایت مفید ثابت ہوئی۔ وہ تعاون کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں کسی ایسی خاتون ڈاکٹر سے مل سکتی ہوں جو گجرات میں خاصی مقبول ہو اور جنھیں میں اپنی فلم میں شامل کر سکوں؟ مجھے جواب کی توقع پہلے سے تھی۔ اسی کی خاطر تو ایک گائنی کولوجسٹ سے ملنے کے لیے اتنی کوشش کی تھی۔

۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات میں جو اس ملک کی سیکولر شبیہ پر ایک بدنما داغ ہیں، بہت سے بھڑکاؤ ایجنٹ سامنے آئے تھے۔ انھیں میں سے ایک مایا کوڈنانی تھی۔ یہ احمد آباد سے ایک ایم ایل اے تھی جس کا نام چشم دید گواہوں نے اپنے بیانات میں لیا تھا کہ وہ اپنے حلقہ انتخاب میں فسادات بھڑکانے والوں میں پیش پیش تھی۔ کوڈنانی میرے لیے ایک اہم کیریکٹر تھی جس کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری تھا کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ اسٹوری کی گہرائی تک پہنچنے میں وہ میری مدد کر سکتی تھی۔

اسی شام ڈاکٹر نے مایا کوڈنانی کو میری موجودگی میں فون کرتے ہوئے بتایا کہ امریکہ سے آئی ہوئی ایک موئثر پروفائل کی فلم ساز اس کا انٹرویو کرنا چاہتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ میرے کارناموں کی ذاتی طور پر تصدیق کر سکتا ہے۔ اپنی اداکاری جاری رکھنے اور شک سے بچنے کے لیے میں بعد میں بھی اس ڈاکٹر سے ہفتے میں ایک بار اپنی 'ریسرچ' کے سلسلے میں ملتی رہی۔

اس شام جب میں لوٹ کر ہاسٹل پہنچی تو کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مائیک نے چند سوالات لکھ رکھے تھے جو مجھ سے پوچھنا تھے۔ اس میں ان لوگوں کے نام بھی شامل تھے جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ مجرم تھے۔ مائیک درست تھا۔ اس کا انتخاب طلبا کے تبادلہ پروگرام میں یوں ہی نہیں ہو گیا تھا۔ اس شام بڑے انہماک کے ساتھ اس نے میری باتیں سنی۔ صحیح سوالات کیے اور لطیف باریکیوں کو ذہن نشین کرتا گیا۔ میں نے اس کو بتایا کہ منصوبہ کیا ہے اور اگر چیزیں منصوبے کے مطابق نہیں ہوتیں تو کس طرح ہمیں اس میں تبدیلی کرنی پڑ سکتی ہے۔ اس نے سوال کیا: 'ہم اس کو کیسے انجام دیں گے؟' 'کل' میں نے جواب دیا۔ 'ہمیں اپنے پہلے امتحان کے لیے جانا ہوگا۔'

دوسرے دن ہماری ملاقات مایا کوڈنانی سے ہونے والی تھی۔ بطور تفتیشی صحافی میں بخوبی جانتی تھی کہ ابتدا میں معلومات آسانی سے نہیں ملتی ہیں۔ اور اگر معلومات فراہم ہونے

بھی لگیں تو زیادہ تجسس کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے مائیک کو خبر دار کیا: 'آج کے دن ہم صرف فلم ساز ہوں گے، صرف فلم ساز۔' مایا بین کی کلینک نروڈا کی شاہراہ پر واقع تھی۔ نروڈا پٹیا کا قتل عام تین بار ایم ایل اے رہ چکی اس ڈاکٹر کی کلینک سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس میں سو سے بھی زیادہ لوگوں کو بے دردی سے مار دیا گیا تھا۔ مایا کوڈنانی کے خلاف الزام تھا کہ یہی وہ عورت تھی جو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے والی بھیڑ کی قیادت کر رہی تھی اور اشتعال انگیز نعرے لگا رہی تھی۔

مائیک اور میں کوڈنانی کی کلینک میں داخل ہوئے جہاں مقامی عورتیں اس کے کیبن کے باہر تنگ بنچوں پر بیٹھی تھیں۔ دروازے کے پاس دو ہٹے کٹے اور گٹھیلے مرد موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس بندوق تھی۔ مجھے اور مائیک کو دیکھتے ہی اس نے ہمیں روک دیا۔ فون پر اپنے باس سے ہمارے سلسلے میں معلوم کیا اور پھر ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ یہ کوڈنانی کا باڈی گارڈ تھا۔ جب سے ایس آئی ٹی (خصوصی تحقیقاتی ٹیم) نے اس کے جرم کا پردہ فاش کیا تھا تب سے وہ اس کی کلینک کی حفاظت کر رہا تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی جس میں اور بھی کئی ڈاکٹروں کی کلینک موجود تھیں۔ کلینک سے متصل ہی ایک آپریشن تھیئٹر بھی تھا۔

ہر جمعرات کو کلینک پر آنے والے مریضوں کی تعداد، جن میں سے اکثریت کم آمدنی والے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں، دوگنی ہو جاتی تھی۔ ایک تختہ پر جلی حروف میں لکھا تھا: 'جمعرات کے روز صرف پچاس روپے فیس۔' کمپاؤنڈر جس نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا تھا آکر مطلع کیا کہ کلینک صرف مقامی لوگوں کو خدمات مہیا کرتی ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں ایک فلم ساز ہوں اور میڈم سے ملنے کی غرض سے یہاں آئی ہوں۔

میں اپنی نوٹ بُک میں کچھ لکھنے میں مشغول تھی جب کہ مائیک ایک ٹی وی سیٹ پر سنسکار چینل دیکھنے میں مگن تھا۔ ایک بوڑھی خاتون نے جو اپنی بہو کے ساتھ وہیں انتظار میں بیٹھی تھی ٹی وی سیٹ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر ٹی وی میں موجود 'بابا' کو خراج عقیدت

پیش کیا۔ یہ منظر دیکھ کر مائیک ششدر ہو کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں اسے دیکھ کر ہنسی اور پھر اپنی نوٹ بک میں مشغول ہو گئی۔

اسی لمحے کوڈنانی کی اسسٹنٹ نے کیبن سے نکل کر پوچھا: 'میتھلی کون چھے؟' اس نے مجھے اور مائیک کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنا اور مائیک کا تعارف خاص انگریزی لہجے میں کروایا اور اس کے بعد گرمجوشی سے مصافحہ ہوا۔

'آپ کو پتہ ہے آپ کا نام بہت خوب صورت ہے۔ سیتاجی کا بھی یہی نام ہے۔' کوڈنانی جو متاثر نظر آرہی تھی بولی۔ 'جی ہاں میَم۔ میرے والد سنسکرت کے ٹیچر ہیں۔ اس لیے گھر میں ہم سب کے نام بہت خوب صورت ہیں۔' کوڈنانی کے لیے یہ بیان تشفی بخش ثابت ہوا جس نے مائیک کی طرف دوبارہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ کوڈنانی کی میز پر طب اور امراض نسواں سے متعلق کتابیں، بی جے پی کے بعض تشہیری کتابچے اور گجرات میں سندھی طبقے سے جڑی بعض دیگر کتابیں اور پمفلٹ موجود تھے۔ اس سے متصل اس کے بیٹے اور بہو کی تصویریں تھیں جو امریکہ میں مقیم ہیں۔ ہم اگلے ایک گھنٹے تک اس کے کیریر پر باتیں کرتے رہے اور وہ اپنے اہل خانہ کے بارے میں بتاتی رہیں۔ اس دوران کولڈ ڈرنک بھی آ گئے تھے۔

مایا بین بہبودیٔ اطفال اور صحت کی وزیر تھی۔ ریاست میں خواتین کی فلاح و بہبود کے تئیں ان کی لگن کو میں نے سراہا۔ 'آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟' آخر کار اس نے پوچھ لیا۔ 'میں بس آپ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی ہوں۔ ہم اپنی فلم میں آپ کو ایک ایسی شخصیت کے طور پر پروفائل کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے گجرات میں ایک مقام حاصل کیا ہے۔' کوئی بھی ذی شعور بالخصوص اگر وہ سیاسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اپنی تعریف اور چاپلوسی بھری باتیں سننا ناپسند نہیں کرتا اور اس چیز کا حصہ ضرور بننا چاہتا ہے جس میں اس کے کارناموں کے قصیدے پڑھے جائیں۔ لہٰذا ہمیں فوراً ہی اس کی رضامندی مل گئی اور اگلے اتوار کو اس نے ہمیں اپنے اپارٹمنٹ میں لنچ کی دعوت دے ڈالی۔ 'یہ تو بہت مناسب ہو گا'

خصوصی زور دیتے ہوئے کہا۔
میں نے انگریزی میں اپنے امریکی لہجے پر
ان کے کیبن سے نکلنے سے پہلے میں کوڈنانی کی ساڑی اور آرائش کی تعریف کرنا نہ بھولی۔
باہر نکلتے ہوئے ہمیں لگا کہ ان کا سیکورٹی عملہ کچھ خاص متاثر نہیں نظر آرہا تھا۔ ہم نے آٹو کیا اور سیدھے پکوان کی طرف روانہ ہوگئے۔ مائیک جو پریشان نظر آرہا تھا کہنے لگا، 'آپ نے غور کیا اس نے مجھ سے بات تک نہیں کی تھی۔' اس سے پہلے کہ مائیک کی اس بات کا میں جواب دے پاتی حلوہ اور ربڑی ہمارے سامنے موجود تھے۔ گجرات میں روایت ہے کہ جب وہ تھالی پروستے ہیں تو میٹھی چیز پہلے پیش کرتے ہیں۔ مائیک کی توجہ بٹ چکی تھی۔ کوڈنانی کو وہ بھلا چکا تھا کیوں کہ مہاراج ہر کھانے کے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات راحت کا باعث تھی۔

لوٹ کر تقریباً دس بجے جب میں ہاسٹل کے کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ باہر جانے سے قبل میں نے اچھی طرح اپنا بستر درست کیا تھا لیکن اب بستر کی چادر شکن آلود تھی اور میرا لیپ ٹاپ بھی آن تھا۔ البتہ سوٹ کیس اور درازوں کو نہیں چھوا گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس شام کوئی میرے کمرے میں آیا تھا۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ درحقیقت اس طرح کی باتوں کا خدشہ مجھے پہلے ہی سے تھا۔ اس لیے گجرات میں داخل ہونے سے پہلے ہی لیپ ٹاپ کو فارمیٹ کر لیا تھا اور اس کا ایڈمن نام میتھلی تیاگی رکھ دیا تھا۔ ڈیسک ٹاپ پر فلم سازی، گجرات کے عجائب خانوں کی تحقیق، فلم انڈسٹری اور جنگلات سے متعلق فائلیں موجود تھیں۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر کرشن جی کا وال پیپر تھا۔ میرے بستر سے متصل شیلف پر فلم اور فوٹو گرافی سے متعلق کتابیں رکھی تھیں۔ یہ بات صاف تھی کہ کسی نے میرے کمرے کی تلاشی لی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کو ایسی کوئی چیز نہیں ملی ہوگی جو انھیں نہیں ملنی چاہیے تھی۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔

اگلی صبح جی ایل سنگھل کے ساتھ ٹیلی فون پر بات ہونی تھی۔ میرے فون پر فوٹو گرافر

دوست اَجے کا ایک پیغام آیا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا آمداوادی نی گپھا میں جاری فوٹو گرافی نمائش میں مجھے دل چسپی ہو گی۔ میں نے فون اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ تبھی مائیک نے دروازے پر دستک دی۔ وہ فاؤنڈیشن کی دوسری طرف سیر کے لیے جارہا تھا اور مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں بھی چلوں گی یا نہیں۔ دسمبر کے مہینے میں گجرات کی شامیں خوب صورت اور سرد ہوتی ہیں۔ اگرچہ ۲۰۱۰ء کا موسم سرما خاص طور سے زیادہ سخت تھا۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ہاسٹل ایک کھلی جگہ اور کم آباد جنگلی علاقے میں واقع تھا۔

ہاسٹل میں صرف ایک کمبل کا سُکھ ہی نصیب تھا۔ جب رات ہوتی تھی تو ہم میں سے اکثر لوگ سوٹ کیس میں موجود ساری چیزیں نکال لیتے اور جو کچھ بھی مل جاتا سب پہننے کی کوشش کرتے۔ ٹی شرٹ، سویٹر، جینس، جو ہمیں گرم رکھ سکتی تھی ہم پہن لیتے تھے۔

میں نے اور مائیک نے اس شام اضافی جیکٹ پہن لیا اور فاؤنڈیشن کی عمارت سے متصل جنگل کے کنارے کنارے چہل قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے مڑ کر مائیک کی طرف دیکھا وہ حسب عادت سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: 'میتھلی، کیا میری کارکردگی ٹھیک رہی؟'' بالکل۔ تم بہت پُر اعتماد معلوم ہو رہے تھے۔ اور ہاں مسز کوڈنانی کے بارے میں فکر مت کرو وہ گفتگو اور اپنی تعریف میں کچھ زیادہ ہی غرق ہو گئی تھی۔' اس کی ہمت بندھاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

بستر پر جانے سے قبل اس رات میں نے اجے کو ایک پیغام بھیجا: 'کل ملتے ہیں، نمائش گاہ میں۔'

دوسری صبح جب میں کینٹین میں اُپما کھا رہی تھی تب میں نے آخرکار جی ایل سنگھل کو فون کیا۔ ان دنوں اس کی زندگی میں طوفان برپا تھا۔ ہائی کورٹ نے ایس آئی ٹی (خصوصی تحقیقاتی ٹیم) کو عشرت جہاں انکاؤنٹر (۱) کی تحقیقات کے لیے متعین کیا تھا۔ تحقیقات میں پیش رفت ہو رہی تھی اور ساری نظریں سنگھل پر تھیں۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اپنے دو دیگر

افسروں کے ساتھ مل کر ایک 'انکاؤنٹر' میں عشرت جہاں کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ انکاؤنٹر کے ایک دن بعد گجرات کے اعلیٰ پولیس افسر اور اے ٹی ایس کے سربراہ ڈی جی ونجارا نے پریس کانفرنس بلوائی تھی۔ یہ ایک سنسنی خیز واقعہ تھا۔ عشرت کا خون آلود جسم ان دیگر تین افراد کے ساتھ سڑک پر پڑا تھا۔ اس کو بھارت کی پہلی ایسی فدائین عورت کے طور پر پیش کیا گیا تھا جس کا تعلق لشکر طیبہ سے تھا اور جو گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے قتل کے درپے تھی۔

ہر طرف عشرت ہی کے چرچے تھے۔ اور بنیاد پرستی کے بارے میں بیانات لکھے جارہے تھے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ کس طرح تشدد پسند مسلم تنظیمیں ۲۰۰۲ء کے فسادات کا انتقام لینے کے لیے نکل پڑی ہیں۔ ڈی جی ونجارا کو ایک ہیرو کی طرح سراہا جارہا تھا۔ راتوں رات وہ شہرت کے بام پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر افسروں کی بھی پذیرائی ہورہی تھی۔ این کے امین، ترون بروت اور وہ شخص جو ان دنوں میری تحقیقی دل چسپی کا مرکز تھا یعنی گریش سنگھل۔

دریں اثنا عشرت کے اہل خانہ نے اپنی بیٹی عشرت جہاں کے 'قتل' کے معاملے میں انکوائری کے لیے سپریم کورٹ میں ایک عرضی داخل کی۔ گجرات ہائی کورٹ کے ذریعہ ایک عدالتی کمیٹی متعین کی گئی تھی اور اس کا فیصلہ ۲۰۰۸ء میں دیا جاچکا تھا۔ لیکن گجرات ہائی کورٹ کے سابق مجسٹریٹ کی سربراہی والی جسٹس تمانگ کمیٹی نے ایک ایسا فیصلہ دیا جس نے پورے ملک کو سکتے میں ڈال دیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ 'عشرت جہاں کا قتل ایک فرضی انکاؤنٹر تھا —معاملے کی مزید تحقیقات درکار ہیں۔'

اس فیصلے کے بعد انسانی حقوق کے کارکنان اور وکلا سڑکوں پر اتر آئے اور ان افسران کے خلاف احتجاج کرنے لگے جنھوں نے اقتدار کا غلط استعمال کرتے ہوئے معصوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ معاملہ یوں ہی رکا رہا یہاں تک اہل خانہ نے گجرات ہائی کورٹ میں

عرضی داخل کی کہ مزید تحقیقات کی جائیں۔ اس عرضی کے نتیجے میں ایک سہ نفری بنچ انکاؤنٹر کے معاملے کی تحقیقات کے لیے تشکیل دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد ۲۰۱۳ء میں گجرات ہائی کورٹ کے ذریعے انکاؤنٹر معاملے پر تحقیقات کے لیے متعین سی بی آئی ٹیم نے بھی اس کو فرضی قرار دیا اور گجرات کے اعلیٰ پولیس افسروں کے نام بطور ملزمین درج کیے۔

یہ ۲۰۱۰ء کی بات ہے، جب اس معاملے کی تفتیش سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق ایس آئی ٹی کو دی گئی تھی، میں نے سنگھل سے ملنے کے لیے پہلی بار وقت مانگا۔ فون بجا اور میں نے خاص انگریزی لہجے میں اپنا تعارف کروایا۔ لیکن جواب زیادہ امید افزا نہیں تھا۔ سنگھل نے مجھے بعد میں فون کرنے کو کہا۔ میری ساری امیدیں اس شخص سے لگی تھیں۔ یہی وہ شخص تھا جس سے مجھے اپنی تحقیقات کی شروعات کرنی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اس معاملے پر آگے کیسے بڑھوں گی؟ اسی صبح اخبارات نے لکھا کہ سنگھل کی گرفتاری ایس آئی ٹی کے ذریعے ہونے والی ہے۔ اس طرح کے کشیدہ حالات میں یہ بات معمول کے بالکل عین مطابق تھی کہ سنگھل بیرون ملک سے لوٹی کسی فلم ساز سے باتیں کرنے کے بجائے اپنے بچاؤ کے لیے قانونی حل تلاش کرنے کے بارے میں سوچتا۔ میں نے مائیک کو مطلع کر دیا تھا کہ آج اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مائیک کی دوستی ہاسٹل میں رہنے والے کچھ لوگوں سے بھی ہوگئی تھی۔ انھیں لوگوں میں سے ایک پانن گواک لنج تھی جو گرین لینڈ کی رہنے والی تھی اور جسے ہم سب پانی کہہ کر بلاتے تھے۔ مجھے لگا کہ مائیک اور اس میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ آج کام کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہوگی تو اس نے پانی کو فوٹو گرافی ٹرپ پر لے جانے کی پیشکش کر دی اور وہ خوشی خوشی راضی بھی ہوگئی۔

مجھے یاد آیا کہ آج شام کو میری اپنی فوٹو گرافی ٹرپ ہے۔ یہ سوچ کر کہ آج کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے میں واپس اپنے کمرے میں چلی آئی اور گزشتہ چند ایام کے حالات کو سپرد قرطاس کرنے لگی۔

اس شام جب میں نمائش گاہ پر پہنچی تو اجے اپنے دوست کی نمائش میں مہمان نوازی کا فرض انجام دے رہا تھا۔ ہر شخص سے میرا تعارف ایک امریکی فلم ساز کے طور پر کرایا گیا۔ بس اتنا کہنا کافی تھا۔ سب لوگ مجھ سے تکنیکی سوالات کرنے میں لگ گئے۔ مثلاً: تمہارا کیمرہ کون دیکھے گا، کون سا کیمرہ استعمال کرتی ہو، شوٹنگ کب شروع کروگی وغیرہ۔ میں نے جوابات کی مشق کرلی تھی کیوں کہ مجھے اس طرح کے سوالات کی توقع پہلے سے تھی اور اس لیے بڑے آرام سے اُن کے جوابات دیے۔ اَجے متاثر لگ رہا تھا۔ اس نے امداوادی نی گپھا کی سیر کروائی اور کافی اور سموسے کے لیے بیٹھنے سے قبل اس جگہ کی تاریخ پر میری ایک مختصر کلاس لے ڈالی۔

ہمارے بغل میں ہی کالج کا ایک گروپ تھا۔ کوئی گٹار بجا رہا تھا تو کوئی ایک کونے میں اپنی محبوبہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کو لگا جیسے سب کچھ بھلایا جاسکتا ہے۔ پولیس افسروں کو۔ اس حقیقت کو کہ میں انڈر کور ہوں۔ اور یہ بھی کہ سر دست میں اپنی ذمے داریوں کے سلسلے میں گھبرائی ہوئی ہوں۔ میں بس ایک عام اسٹوڈنٹ کی طرح ہوگئی۔ گھر پر موجود اپنے اہل خانہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ میرے والدین جن سے بات ہوئے کئی روز گزر گئے تھے اور جو اچانک میرے طور طریقے میں تبدیلی دیکھ کر پریشان بھی ہوگئے تھے۔ میں نے اپنا موبائل فون بند کردیا تھا اور صرف ای میل کے ذریعے اُن سے رابطہ کرتی تھی جو مقامی سائبر کیفے سے بھیجتی تھی۔ وہ بھی زیادہ نہیں۔ جب سے میں نے امت شاہ سے متعلق انکشاف کو شائع کیا تھا وہ میری خیریت کے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔

اس طرح کے خیالات جب آنے لگے تو میں نے اَجے سے گزارش کی کہ میرے ہاسٹل سے قریب کسی مقامی مارکیٹ تک وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہاں مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ اس نے مجھے سیٹلائٹ روڈ پر واقع شاپنگ علاقے میں چھوڑ دیا جو مہنگے بازاروں پر مشتمل علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ صحیح معنی میں مجھے کام ہے میں ایک سپر

مارکیٹ کے اندر چلی گئی۔ کچھ اشیا خریدیں اور پھر سپر مارکیٹ سے ٹھیک متصل ایک پی سی او میں گھس گئی۔ رابطہ رکھنے کا یہ سب سے محفوظ طریقہ تھا۔ میں نے اپنے گھر کا لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔ میری ماں جو ہمیشہ میری قوت کا سر چشمہ رہی ہیں، انھوں نے فون اُٹھایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں واپس لوٹ آؤں۔ اس کو صحافت نہیں کہتے ہیں کہ مجھے اپنے ہی اہل خانہ کے ساتھ رابطے سے محروم رہنا پڑے۔ جتنا مجھ سے ہو سکتا تھا میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور دل میں ویرانی کا احساس لیے فون رکھ دیا۔

اگلی صبح میں نے سنگھل کو دوبارہ فون کیا اور اس بار اس نے ملاقات کا وعدہ کر لیا۔ وہ پریشان کن سفر جس پر میری تحقیقات مجھے لے جانے والی تھیں اس کی ابتدا آخر کار ہو چکی تھی۔



باب سوم

جی ایل سنگھل

گریش سنگھل کے بڑے بیٹے ہارد ک نے ۲۰۱۲ء میں خودکشی کرلی تھی۔ اس کے قریبی لوگوں کا کہنا تھا کہ اس واقعے نے اس کے باپ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ٹیلیفون پر ہماری گفتگو کے بعد ۲۰۱۰ء کی اس صبح میری ملاقات سنگھل سے ہوئی۔ مائیک بھی میرے ساتھ تھا جسے میں نے موقع کی نزاکت کے بارے میں پہلے ہی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ سنگھل کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ گجرات اے ٹی ایس کا انچارج تھا۔

اس وقت ایس آئی ٹی کی تحقیقات کی وجہ سے سنگھل کی حرکات وسکنات پر بہت قریب سے نظر رکھی جارہی تھی۔ وہ لوگوں سے ملنے جلنے کے معاملے میں خاصا محتاط رہتا تھا۔ اس کی گرفتاری کسی بھی وقت ہوسکتی تھی۔ ایس آئی ٹی اپنی انکوائری تیز کررہی تھی۔ دو نچلے درجے کے افسر گرفتار کیے جاچکے تھے اور اگلی باری سنگھل کی ہوسکتی تھی۔ دیگر چیزوں کے علاوہ جو الزامات سنگھل اور دیگر افسروں پر لگائے گئے تھے ان میں ایک دہشت گردی کے نام پر ایک معصوم لڑکی کے خلاف سازش کرکے اُسے مارڈالنا بھی شامل تھا۔

گجرات میں ایسا ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فسادات کے بعد دشمنی کی ایک عام فضا تھی۔ اگرچہ تعلقات پہلے بھی کچھ خاص دوستانہ نہیں تھے لیکن یہ صاف تھا کہ دونوں فرقوں کے درمیان تعلقات بد سے بدتر ہوگئے تھے۔ نریندر مودی کو ایک ایسے ہندو لیڈر کے طور پر دیکھا جارہا تھا جس نے گجراتی اسمیتا کو بچایا تھا۔ گجرات ٹرین آتش زنی اور ٹھیک اس کے بعد

گجرات میں ہونے والے قتل عام کی وجہ سے دونوں فرقوں کے لوگوں کو جھلسنا پڑا تھا۔ نوکرشاہ اور افسروہ لوگ تھے جو موردالزام ٹھہرے تھے لیکن ان کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا جاسکا۔ ان برسوں میں انکوائری کمیشنوں نے ارباب اقتدار کی ان کے عمل یا بے عملی پر شدید ترین الفاظ میں مذمت کی تھی۔ لیکن پھر بھی چند پیادوں کو چھوڑ کر بیشتر اقتدار کے مناصب پر بدستور فائز رہے۔ شاید اسی سے شہہ پاکر گجرات میں انکاؤنٹروں کا ایک سلسلہ چل پڑا جن میں سے اکثر فرضی قرار پائے۔ انھیں فرضی قرار دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ بھارت کی عدالت عظمیٰ تھی۔ یہ سب انکاؤنٹر یہ دکھانے کی کوشش میں کیے گئے تھے کہ گجراتی اسمیتا کے سامنے خطرہ منڈلا رہا ہے۔

گجرات کے فرضی انکاؤنٹروں میں ایک گھناؤنا پیٹرن نظر آتا ہے۔ سمیر خان پٹھان، صادق جمال، عشرت جہاں، جاوید عرف پرنیش پلئی، سہراب الدین، تلسی رام پرجاپتی، یہ تمام گجرات میں کیے گئے چند ایسے انکاؤنٹر ہیں جن کے معاملات ملک کے اعلیٰ ترین عدالتی اداروں میں زیر سماعت ہیں۔ ان معاملوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی باریکی سے تیار کیے گئے منصوبوں کے ساتھ قتل کی داستان کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ دسمبر ۲۰۱۱ء میں میں نے تہلکہ میں اپنے ایک مفصل انکشاف میں لکھا تھا:

> البتہ گجرات کے فرضی انکاؤنٹروں کو خاص طور پر جو چیز پریشان کن بنا دیتی ہے وہ ہے ان انکاؤنٹروں کے بارے میں وہ وحشت ناک اور بے بنیاد پروپیگنڈا جو ان کے بارے میں پھیلایا جا رہا ہے۔ وہ تمام مقتولین جو ان فرضی انکاؤنٹروں میں مارے گئے ان کو عوام میں لشکر طیبہ کا دہشت گرد قرار دیا گیا جن کا مقصد وزیر اعلیٰ مودی، نائب وزیر اعظم ایل کے اڈوانی اور اشتعال انگیز ہندوتوا لیڈر جیسے پروین توگڑیا اور جے دیپ پٹیل کو قتل کرنا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے بعد فرقہ وارانہ خطوط پر منقسم گجرات میں اس طرح کا بے بنیاد پروپیگنڈا پٹرول کو ماچس دکھانے کے مترادف ہوگا۔ یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی بھی مسلم لڑکا قطعی

طور پر ملک میں ہونے والے دہشت گردانہ دھماکوں میں ملوث نہیں لیکن جنونی انداز میں 'خطرات' کو گڑھنے اور معمولی مجرموں کو 'دہشت گرد' باور کرانے کی اس کوشش کے پیچھے پوری مسلم ملت کو وطن دشمن ثابت کرنے کی ذہنیت کار فرما ہے تاکہ مودی کی ہندو ہردے سمراٹ والی شبیہ کو تقویت مل سکے، یعنی ایک ایسا شخص جو ہندو دشمنوں کو سبق سکھانے کی اہلیت رکھتا ہے اسے جہادی تنظیموں سے خطرہ درپیش ہے۔(۲)

اس سے قبل تہلکہ میں شائع شدہ ایک اسٹوری (۳) میں ثابت کیا گیا تھا کہ سہراب الدین جو ایک معمولی مجرم اور تاوان کی رقم وصول کرنے والا غنڈہ تھا، مارے جانے سے قبل اس کی امت شاہ سے اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ اس بات پر بڑے پریشان کن سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آخر کیوں سہراب الدین کو راستہ سے ہٹا کر اس پر دہشت گردی کا لیبل لگادیا گیا۔ ملحوظ رہے کہ شاہ اس دوران نہ صرف وزیر داخلہ تھا جو ریاستی پولیس کے کاموں کے لیے بلاواسطہ ذمہ دار تھا بلکہ وہ ایسا شخص بھی تھا جو مودی سے اس قدر قریب تھا کہ تقریباً درجن بھر سے زیادہ وزارتی عہدے اس کے پاس تھے۔ بدنام زمانہ پولیس افسر ونجارا بھی امت شاہ سے بہت قریبی روابط رکھتا تھا۔

تاہم ۱۹ سالہ عشرت جہاں کے بے رحمانہ قتل کے معاملے میں سنگھل ان دنوں مشکل میں تھا۔ دیگر فرضی انکاؤنٹروں میں اس کا کردار محض متعلقہ تفتیشی ٹیم کو گمراہ کرنے تک محدود تھا۔

اس صبح میری ملاقات گریش سنگھل سے ہوئی۔ میں اس کے سخت پہرے میں گھرے آفس میں مائیک کے ساتھ پہنچی۔ اس کا آفس احمد آباد کے شاہی باغ علاقے میں واقع تھا۔ سنگھل کے گزشتہ کارناموں میں اکشردھام حملہ کو کامیابی سے سنبھالنا شامل تھا، جس کے لیے اس کو ریاست کے بہادری ایوارڈ سے نوازا جاچکا تھا۔ جی ایل سنگھل کی عمر کے افسر کو اس طرح

پذیرائی ملنا غیر معمولی تھا۔ تاہم اس کے محکمے کے اکثر لوگ اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اے ٹی ایس آفس کے پاس موجود سیکورٹی گارڈ الجھن میں تھا۔ اسکرٹ پہننے والی ایک عورت، گلوبند لگائے ایک غیر ملکی کے ساتھ۔ بھلا ان لوگوں کو اے ٹی ایس کے سربراہ سے کیا کام آپڑا؟ بہر کیف اندر ایک نوٹ بھیج دیا گیا۔

چند منٹوں کے اندر ایک کانسٹیبل گارڈ کے پاس آیا اور گجراتی میں سرگوشی کرتے ہوئے ہمارے بارے میں بولا کہ ہم غیر ملکی فلم ساز ہیں جو صاحب سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ جب مائیک کو اور مجھے اندر لے جایا جارہا تھا تو گارڈ کے چہرے پر مرعوبیت کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ مائیک حسب معمول ہشاش بشاش تھا۔ اس طرح کے حالات میں ۱۹ برس کا کوئی اور نوجوان ہوتا تو بدحواس ہو جاتا لیکن اس پر تو کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ البتہ مجھے اس کے بارے میں تھوڑی تشویش تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آیا حالات کی نزاکت اور ان سے جڑے خطرات کو وہ پورے طور پر سمجھ پایا بھی تھا کہ نہیں؟ لیکن میرا یہ خدشہ اس وقت رفع ہو گیا جب ہم ویٹنگ روم میں داخل ہوئے۔ کانسٹیبلوں اور اعلیٰ افسروں کی ایک ٹیم سادہ لباس میں ہمارے ساتھ انتظار کے دوران موجود تھی۔ لیکن مضبوط اسپورٹ شوز انھیں عام شہریوں سے ممتاز کرنے کے لیے کافی تھے۔ ٹیلی ویژن سیٹ پر بالی ووڈ کی کوئی فلم چل رہی تھی جو مائیک کی دل چسپی کا سبب بنی رہی۔ یہ گووندا کی فلم تھی جسے دیکھنے میں بعض افسر محو تھے جب کہ دیگر اپنے معمول کے کاموں میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک کچھ زیادہ ہی متجسس تھا۔ وہ مائیک کے بازو میں آکر بیٹھ گیا اور بڑے ادب سے اس کو 'نمستے' کیا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات شروع ہوئی۔ بھارتی کھانوں سے لے کر بدیس ملک کی تفصیلات تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ حالات پوری طرح اب مائیک کے قابو میں تھے۔ نہ گھبراہٹ کے آثار تھے نہ ضرورت سے زیادہ جوش کا اظہار۔

'میتھلی تیاگی، آپ کو صاحب بلاتے ہیں۔' اردلی نے آکر بتایا۔ اس کے ساتھ ہی پہلا ایکٹ شروع ہو گیا۔

گریش سنگھل، عمر کی چوتھی دہائی میں قدم رکھ چکا تھا، نرم خو، خوش پوشاک اور خوش خلق شخص تھا، ادھ جلی سگریٹ ہاتھ میں دبائے ہوئے اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اپنے لیپ ٹاپ پر وہ ایک ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ اوشو کی چند کتابیں اس کی میز پر پڑی تھیں۔ 'آپ اوشو کو مانتے ہیں؟' بیٹھتے ہی میں نے سوال داغ دیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اپنی ڈائری میز کے سرے پر رکھی۔ ویڈیو ریکارڈر اسی میں لگا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ خفیہ طریقے سے گفتگو ریکارڈ کرنے سے قبل میں اپنے سبجیکٹ سے اچھی طرح تعارف حاصل کروں گی۔ لیکن سنگھل کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک متلون مزاج شخص ہے۔ اگر اس نے کوئی اہم بات کہی اور اس وقت میرا ریکارڈر میرے ساتھ نہ ہو تو کیا ہو گا۔ اور اگر اس نے اگلی بار ملاقات کا وقت ہی نہ دیا تب کیا ہو گا؟

میں نے سنگھل سے مائیک کا تعارف کروایا۔ پھر اپنے مصنوعی انگریزی لہجے میں آنے کی غرض اسے بتانے لگی۔ سنگھل بڑی سنجیدگی سے میری باتوں کو سنتا رہا۔ میرے ہر لفظ کو اس نے بغور سنا اور بیچ بیچ میں سر بھی ہلاتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس کی توجہ میری طرف مبذول ہو چکی ہے تو میں نے کچھ مانوس ناموں کو گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ 'دراصل مایا بین آپ سے بہت متاثر تھیں اور ان کا ماننا ہے کہ ریاست کے ذہین ترین افسروں میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ اپنی فلم کے لیے ان کی پروفائل بھی ہم تیار کر رہے ہیں۔' اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے چہرے کی خشونت اور سنجیدگی نرم پڑ چکی تھی۔ مسکراتے ہوئے کہا: 'وہ بہت ہی اچھی اور مذہبی خاتون ہیں۔'

میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہو گا کہ جن تنازعات میں وہ گھرا ہے ان سے متعلق کسی بات کو گفتگو میں نہ لایا جائے۔ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے بھولے پن اور مرعوبیت کا مظاہرہ زیادہ آسان معلوم ہوا۔ اس نے اپنے بچپن کے قصے سنانا شروع کر دیے۔ اعلیٰ طبقے سے مقابلے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ برہمن پڑوسیوں کا اپنی دلت فیملی کے تئیں طرز عمل کا ذکر

معاون ہو سکتا ہے۔ وہ ایک سال پہلے ریٹائر ہوا تھا اور احمد آباد میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ شاید ہمارے کام سے قائل ہو کر اس نے 'سر' سے ہماری سفارش کی پیشکش بھی کر دی تاکہ ہم آسانی سے اس سے مل سکیں۔

سنگھل کے ساتھ ایک گھنٹے تک بات چیت کے بعد ہم اے ٹی ایس کے زبردست سیکورٹی والے ہیڈ کوارٹرز سے باہر آئے۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ باہر نکلتے ہوئے ہم نے سیکورٹی گارڈ کو سر ہلا کر سلام کیا تو اب کی بار جواب میں وہ بھی مسکرا دیا اور ہمارے لیے آٹو رکشا والے کو بلانے دوڑا۔ ایک کلو میٹر کی دوری طے ہونے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ 'سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، ہے نا؟' مائیک نے پوچھا۔ میں نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

اگلے کچھ دنوں تک ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ سنگھل کو کچھ وقفہ دیا جائے۔ اسے بار بار فون کریں گے تو اس سے صرف ہماری بے صبری ظاہر ہو گی اور ہم شک کے دائرے میں بھی آسکتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی میں اس کو پیغامات بھیج کر یہ بتاتی رہتی تھی کہ اس کے بارے میں ہم نے کتنی تحقیقات کی ہیں اور ریاست کے تئیں اس کی لگن اور یکسوئی سے ہم کس قدر متاثر ہیں۔ ہماری اگلی ملاقات کا دن جلد ہی آگیا۔

اس بار میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مائیک کو ساتھ نہ لے جایا جائے۔ یہ سبق میں نے سیاست دانوں کا انٹرویو لیتے ہوئے یا افسروں کے ساتھ آف دی ریکارڈ گفتگو کرتے ہوئے سیکھا تھا۔ یہ لوگ اس وقت زیادہ اطمینان محسوس کرتے ہیں جب کم سے کم لوگ موجود ہوں اور کوئی ان کی باتیں بس نوٹ کرتا جائے۔ جہاں تک گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا سوال تھا تو اس دن میں پہلے سے زیادہ تیار تھی۔ سابقہ ملاقات سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگلی ملاقات ضرور انکشافاتی نوعیت کی ہو گی۔ مجھے قطعاً مایوسی ہاتھ نہیں آئی۔

اس دو پہر کو بڑی احتیاط سے میں نے خصوصی طور پر تیار کیے گئے اپنے سبز کرتے کو

چارجنگ پوائنٹ سے نکالا۔ کرتے کا اوپری حصہ گہری کشمیری دست کاری سے مزین تھا جس کی وجہ سے ایک چھوٹا سا سوراخ ڈھک گیا تھا جو دراصل اس کیمرے کا راستہ تھا جو اس کے اندر لگایا گیا تھا۔ ایک پتلی سی تار مزید نیچے کی جانب گئی تھی جس میں ایک چھوٹا سا بٹن لگا ہوا تھا۔ جب بھی کبھی کچھ ریکارڈ کرنا ہوتو اس بٹن کو ہر بار مجھے آن اور آف کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ بڑی آزمائش کا کام تھا، کیوں کہ جب بھی کیمرے کا بٹن آن کیا جاتا تو ایک سرخ بتی جل اُٹھتی تھی جو کیمرے کے آن ہونے کا شارہ تھا۔ اگر چہ میں نے اس کی خاصی مشق کی تھی لیکن پھر بھی یہ خدشہ تھا کہ کہیں بتی بجھی نہ ہو۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے میں نے منصوبہ بنایا کہ میں اپنے قلم کو ڈیسک سے نیچے گرادوں گی اور جب اسے اُٹھانے کے لیے جھکوں تو جلدی سے کرتے کے اندر جھانک کر دیکھ لوں گی کہ واقعی سرخ بتی جل رہی ہے کہ نہیں۔

اس دن جب میں ہیڈ کوارٹرز میں داخل ہوئی تو سیکورٹی گارڈ کی جانب سے مانوس اشارہ ملا جو مجھے کوئی غیر مقیم بھارتی فلم ساز سمجھ بیٹھا تھا۔ اردلی نے اکثر افسروں کو میرے بارے میں کچھ ایسا ہی تاثر دیا تھا۔ چہکتے ہوئے اس نے پوچھا بھی تھا: 'میڈم شوٹنگ نہیں کروگی کیا؟' میں نے سر ہلا کر اشارہ کیا کہ کام جلد ہی شروع ہو جائے گا۔ اس دوپہر کو میں سنگھل کی کیبن میں اس توقع سے داخل ہوئی تھی کہ خندہ پیشانی سے میرا استقبال ہو گا۔ لیکن اس کے چہرے کے ہاو بھاو سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ کوئی ویڈیو دیکھ رہا تھا جو اس کے رہائشی علاقے کے کچھ بدمعاشوں کی ایک اسٹنگ فوٹیج تھی۔ اے ٹی ایس انچارج کے درجے کے ایک افسر کے لیے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بات کچھ اور تھی۔ دراصل پولیس فورس کے کچھ افسر اس کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔

لیکن پھر اس نے اس قصے کو ختم کیا اور اس کی پرانی خوش مزاجی لوٹ آئی۔ وہ اپنے بارے میں میری تحقیقات کے حوالے سے متجسس تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ آیا میں نے اس کے بارے میں دوسروں سے رائے لی ہے؟ کیا یہ رائیں مثبت ہیں؟ اب میرے لیے وہ وقت آچکا

تھا کہ لاس اینجلس کی اسی بھولی بھالی لڑکی کا کردار ادا کرنا شروع کردوں جس کو ملک کے حالات کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ وہ تو بس اپنے سامنے بیٹھے شخص کی عظمت سے مرعوب ہے جس نے ملک پر ہونے والے ایک سب سے بڑے دہشت گردانہ حملے میں دہشت گردوں کو مار گرایا تھا۔ میں نے کہا، ’آپ بہت بہادر ہیں۔ جب اکشر دھام حملوں کے بارے میں گوگل پر میں تلاش کرنے لگی تو بہت حیرت انگیز تفصیلات دیکھنے کو ملیں۔ اس نے سگریٹ جلائی اور مجھ سے بولا کہ اپنے سوالات شروع کرو۔ جیسے جیسے تہیں کھلتی گئیں مجھے اس کی نسبتاً مشکل زندگی کی جھلک ملتی گئی۔ جوابات زیادہ تر مبہم تھے۔ لیکن لمبی خاموشی، پر خیال نگاہیں، اور انگلیوں سے ڈیسک کو تھپتھپانا بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ سنگھل اپنے خیال اور جوابات کے سلسلے میں محتاط رہے گا لیکن شاید اپنے سامنے ایک بے ضرر انٹرویو لینے والی کے خیال سے اس دن اس نے سب کچھ کہہ ڈالا۔

میں نے اس کے گھر پر اس کے اہل خانہ، بچوں اور بیوی کی موجودگی میں اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ کہنے لگا: ’ارے پلیز، ایسا مت کرو۔ وہ تو پہلے ہی سے دکھی ہیں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں وہ انھیں پسند نہیں۔ اب تو انھیں میری نوکری سے نفرت ہونے لگی ہے۔ جب بھی کوئی پولیس کی گاڑی گھر پر آتی ہے تو میں ان سے کہتا ہوں کہ دور لے جاکر کھڑی کریں اور میرے گھر کے دروازے کے آس پاس بھی نہ آئیں۔‘ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے انکاؤنٹر کا ذکر کر دیا جس سے میرے لیے یہ آسان ہو گیا کہ اب سوالات کا سلسلہ اس طرف موڑ دوں۔ اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کے وقت، جب کہ سنگھل کو گرفتار کیا جاچکا ہے، یہ بتادوں کہ سنگھل نے سی بی آئی کے سامنے اپنے رول کے بارے میں اعتراف کر لیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، اس نے اپنے بیانات اور ٹیپ شدہ آڈیو ریکارڈنگ (۴) میں اس بات کے بھی شواہد پیش کیے ہیں کہ ریاستی حکومت کے متعدد افسر عشرت جہاں کے فرضی انکاؤنٹر میں ملوث تھے۔ گجرات ہائی کورٹ کے ذریعے متعین شدہ سی بی آئی تحقیقات نے اپنی چارج شیٹ میں نتیجہ نکالا

ہے کہ عشرت جہاں لشکر طیبہ کی کارکن نہیں تھی اور یہ کہ یہ انکاؤنٹر فرضی تھا۔
کورٹ کو جو چارج شیٹ پیش کی گئی ہے (۵) اس میں سنگھل کے ذریعے سی بی آئی کو دیے گئے شواہد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ اس کا اقبال جرم اور گرفتاری اس کے بڑے بیٹے ہاردک کی بے وقت موت کے بعد پیش آئی ہیں جس کا ذکر سنگھل نے اپنی پہلی ملاقات کے وقت بڑے جذباتی انداز میں کیا تھا۔ میڈیا میں اپنے باپ کے بارے میں مسلسل بُری خبروں سے تنگ آکر اس کے بیٹے نے ۲۰۱۲ء میں خودکشی کرلی تھی۔ سنگھل کے قریبی لوگوں کا کہنا ہے کہ اس واقعے نے اس کی سوچ میں زبردست تبدیلی پیدا کردی۔ تازہ ترین خبر اس کے بارے میں یہ ہے کہ پولیس فورس سے اس نے استعفیٰ دے دیا ہے اور حکومت کی جانب سے ترغیب دلانے کے باوجود اپنا استعفیٰ واپس لینے سے انکار کر دیا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ سنگھل نے سی بی آئی سے یہ بھی کہا ہے کہ نہ تو وہ گواہ بننا چاہتا ہے اور نہ ہی معافی کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمام دیگر مجرموں کی طرح اس کا مقدمہ بھی چلے۔ کسی کے دماغ میں کیا چل رہا ہے یہ جاننا مشکل ہے۔ کسی کو جاننے کی بنیاد پر ہی کوئی کسی کے بارے میں قیاس آرائی کر سکتا ہے۔ لیکن سنگھل کی سی بی آئی سے کی گئی عجیب و غریب گزارش مجھے دسمبر ۲۰۱۰ء میں ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کی یاد دلاتی ہے۔

جی ایل سنگھل کے ساتھ ہونے والی ریکارڈ شدہ گفتگو کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

سوال: آپ پولیس والوں کو گجرات میں کتنا کچھ سہنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر متنازع مسائل کے تعلق سے؟

جواب: یہ ایک عجیب صورت حال ہے۔ اگر کوئی آدمی ہمارے پاس شکایت لے کر آتا ہے اور شکایت کرنے والے کو ہم مطمئن کر دیتے ہیں تو حکومت ہم سے ناراض ہو جاتی ہے اور اگر ہم حکومت کو خوش کر دیں تو شکایت کرنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ ہم کیا کریں؟ پولیس تو بے چاری پھنس گئی۔

سوال: انکاؤنٹروں کے معاملوں میں ملوث اکثر افسروں کا تعلق نچلے طبقے سے ہے۔ ان میں سے اکثر کو استعمال کر کے انھیں بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ سیاسی نظام کے ذریعے۔

جواب: ہاں، سب کے سب۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں۔ یہ بڑا طاقت ور ڈپارٹمنٹ ہے۔

سوال: فسادات نے ریاست کو اور پولیس کو کس طرح متاثر کیا ہے؟

جواب: دیکھو، فسادات کے دوران میں نے گجرات میں کام کیا ہے۔ ۱۹۹۱ء سے ہی یہاں پر ہوں۔ اس لیے میں نے بہت سے فسادات دیکھے ہیں۔ ہم نے ۸۲ء، ۸۳ء، ۸۵ء، ۸۷ء کے فسادات دیکھے ہیں اور ایودھیا کے بعد ۹۲ء کا فساد بھی دیکھا ہے۔ مسلمانوں کا غلبہ زیادہ تھا۔ ۲۰۰۲ء میں زیادہ تر مسلمان مارے گئے۔ دیکھو مسلمانوں کے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ خاص کر ۲۰۰۲ء میں تو ایسا ہی تھا۔ اتنے برسوں تک مسلمان ہندوؤں کو مارتے آرہے تھے۔ ۲۰۰۲ء میں جو کچھ ہوا وہ گزشتہ تمام برسوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں پٹنے کا انتقام تھا۔ دنیا بھر میں ہر شخص نے بڑا واویلا مچایا۔ انھوں نے اس حالت کو نہیں دیکھا جس میں ہندو مارے گئے۔

سوال: میں راجن پریادرشی سے ملی تھی۔ وہی جن سے بحیثیت دلت بات کرنے کے لیے آپ نے مجھ سے کہا تھا۔

جواب: اچھا! تمھیں پتہ ہے میں نے مختلف عہدوں پر رہ کر اپنی خدمات انجام دی ہیں اور ریاست کے تقریباً تمام ممکنہ افسروں کے ساتھ کام کیا ہے۔ درجہ بندی کے اعتبار سے میں وسط میں ہوں اس لیے میرا خیال ہے کہ میں نے ہر ایک کے ساتھ کام کیا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا ہے کہ اس جیسے کسی آدمی سے میری ملاقات ہوئی ہو۔ وہ سب سے زیادہ راست باز افسر ہے۔ وہ ایک ایسا افسر ہے جس کو پولیس نظام کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔

سوال: وہ کہہ رہے تھے کہ حکومت ان سے چاہتی تھی کہ وہ سمجھوتہ کریں لیکن انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا؟

جواب: ارے ہاں۔ انھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ان کو میں جانتا ہوں۔

سوال: کیا یہ واقعی مشکل ہے کہ آدمی سمجھوتہ نہ کرے اور پھر بھی سسٹم کا حصہ بنا رہے؟

جواب: اگر سمجھوتہ کر لیا تو پھر ہر چیز کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ اپنے آپ سے، اپنے خیالات سے، یہاں تک کہ ضمیر سے بھی۔

سوال: تو کیا گجرات میں کام کرنے والے ایک افسر کے لیے ضمیر کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہے؟

جواب: بالکل، ہاں۔ اور جب قانون کی سمجھ رکھنے والا ایک اعلیٰ افسر سمجھوتہ کر لیتا ہے تب بڑی مشکل ہوتی ہے۔

سوال: تو کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے؟ آپ کو کتنا لڑنا پڑا؟

جواب: کچھ لوگ ہیں جو کوشش کرتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مرتے دم تک لڑتے ہیں۔ پریادرشی انھیں میں سے ایک ہے۔

سوال: آپ کا معاملہ کیا ہے؟

جواب: میں نے بھی کیا ہے۔

سوال: لیکن کیا سسٹم نے آپ کی حمایت کی؟

جواب: نہیں۔ ذرا بھی نہیں۔ میں ایک دلت ہوں لیکن ایک برہمن کی طرح میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اپنے دھرم کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ ان میں سے بہتوں سے زیادہ معلوم ہے لیکن لوگوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔ اگر میں ایک دلت گھرانے میں پیدا ہو گیا تو کیا یہ میری غلطی ہے؟

سوال: کیا ایسا کبھی ہوا ہے کہ ان کی خدمت کرنے کے باوجود جب آپ کی ترقی کی بات آتی

تھا، سب کو وہاں رکھا گیا۔ قید کیا گیا اور اذیتیں دی گئیں۔ مگر ٹھیک ہے نا۔ سب کو اذیتیں تو نہیں دیں۔ ۱۰/ فیصد ایسے لوگ ہیں جن کو اذیتیں دی گئیں چاہے انھوں نے کوئی جرم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ ایک فیصد ہو سکتا ہے کہ غلط ہوں۔ ملک کو بچانے کے لیے یہ کرنا پڑتا ہے۔

سوال: تو یہ لوگ کون تھے۔ لشکر کے دہشت گرد؟

جواب: ہاں۔

سوال: وہ لڑکی عشرت بھی؟

جواب: دیکھو۔ وہ تو نہیں تھی۔ لیکن جب وہ بھی اسی واقعے میں ماری گئی تھی، میرا مطلب کہ وہ ہو بھی سکتی تھی اور نہیں بھی ہو سکتی تھی۔ یا ہو سکتا ہے اس کا استعمال پردے کے طور پر کیا گیا ہو۔

سوال: میرا مطلب ہے آپ سب لوگ ونجارا، پانڈیان، امین، پرمار اور بیشتر دیگر افسر سب کے سب نچلی ذات کے لوگ تھے۔ جو کچھ بھی آپ لوگوں نے کیا وہ تو ریاست کی خاطر کیا نا۔ تو پھر یہ تو استعمال کرو اور چھوڑ دو والی بات ہو گئی؟

جواب: ارے ہاں۔ ہم سب کے سب تھے لیکن سرکار ایسا نہیں سوچتی۔ ان کا خیال ہے کہ ہم ان کی بات ماننے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے (تیار) رہتے ہیں۔ ہر سرکاری نوکر جو کچھ بھی وہ کرتا ہے سرکار کا کام کرتا ہے اور پھر نہ سماج آپ کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور نہ سرکار۔ ونجارا نے کیا کیا؟ لیکن کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

سوال: لیکن سر، آپ لوگوں نے جو کچھ بھی کیا وہ تو سرکار کے کہنے پر کیا۔ سیاسی قوتوں کے کہنے پر، تو ان لوگوں کو کیوں نہیں۔۔۔؟

جواب: سسٹم کے ساتھ رہنا ہے تو لوگوں کو سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے؟

سنگھ جو دلّی میں اسپیشل سیل میں جوائنٹ کمشنر آف پولیس کے عہدہ پر فائز تھے ان کا تبادلہ میزورم میں کر دیا گیا ہے۔ ان کے زمانہ میں ۴۴/۴۴ انکاؤنٹر ہوئے اور اب وہ ہماری ایس آئی ٹی کے چیئر مین ہیں۔ اس کے بعد ایک اور افسر ہے جس کا نام ستیش ورما ہے اور حقوق انسان کا علمبر دار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ڈینگیں ہانکتا ہے لیکن اس نے بھی قریباً دس انکاؤنٹر کیے ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ صاف ستھری شبیہ کا آدمی ہے۔

سوال: اس کا منطقی انجام کیا ہو گا؟

جواب: دیکھتے ہیں۔ ویسے کچھ نکل کر باہر نہیں آئے گا اس سے۔

سوال: لیکن آپ اور بہت سے دیگر افسران بھی سہراب الدین معاملے میں ملوث تھے۔ ہے نا؟

جواب: ہاں۔

سوال: میں گیتا جوہری سے ملی تھی۔

جواب: ارے ہاں۔ اس نے بہت اچھی تحقیقات کی تھیں اور پھر اس کے بعد رجنیش رائے نے بھی۔ ان لوگوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ تقریباً ۱۳، لوگوں کو انھوں نے خود گرفتار کیا تھا۔

سوال: لیکن یہ امت شاہ چیز کیا ہے؟ آپ کے افسروں کے بارے میں بھی سنتی ہوں۔ میرا مطلب ہے افسر بمقابلہ سیاسی جماعت جیسی کوئی چیز ہے؟ خاص کر انکاؤنٹروں کے تناظر میں؟ مجھے ایسا محسوس ہوا کیوں کہ بہت سے وزرا سے بھی میں ملی ہوں۔

جواب: دیکھو۔ وزیر اعلیٰ بھی۔ وہ سب وزرا جو تمھیں یہاں نظر آتے ہیں، یہ سب کے سب ربڑ اسٹامپ ہیں۔ سب فیصلے وزیر اعلیٰ خود لیتا ہے۔ تمام وزرا کو جب کوئی فیصلہ لینا ہوتا ہے تو اس کے لیے انھیں پہلے وزیر اعلیٰ سے اجازت لینی پڑتی ہے۔

سوال: لیکن پریادرشی (اس کا سینئر) تو سرکار کے قریب نہیں تھے؟

جواب: وہ سرکار کے قریب تھے لیکن جب بھی وہ لوگ ان سے کچھ غلط کرنے کو کہتے وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

سوال: ہاں۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے ان سے ایک انکاؤنٹر کرنے کو کہا تھا جس میں پانڈیان بھی شامل تھا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔

جواب: اگرچہ پانڈیان بھی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ میں اس کے پس منظر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا ہوں۔

سوال: وزیر داخلہ کے اتنے قریب کیسے ہو گیا وہ؟

جواب: ہاں۔ اے ٹی ایس میں آنے سے پہلے وہ انٹیلی جنس میں تھا۔

سوال: دیکھیے میں جانتی ہوں کہ وزیر اعلیٰ اور وزیر داخلہ دونوں اپنے فائدے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ تو کیا اب آپ لوگوں کے لیے کام آسان ہے؟

جواب: بعض چیزیں ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ ہم نے سسٹم کے لیے کام کیا ہے۔

سوال: کیا آپ بھی راڈار پر ہیں یا آپ کا معاملہ نمٹ چکا ہے؟

جواب: کیس ابھی چل ہی رہا ہے۔ اچھا خاصا۔

سوال: تو کیا ریاست آپ کی مدد کر رہی ہے کہ نہیں؟

جواب: دیکھو۔ چاہے بی جے پی ہو یا کانگریس، سیاسی پارٹیاں تو بس سیاسی پارٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ پہلے وہ اپنا فائدہ دیکھیں گی، کن حالات میں انھیں کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے معاملہ میں وہ مدد کر رہے ہیں۔ لیکن وہ بھی یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس سے انھیں کیا ملے گا اور کیا نہیں ملے گا۔ اگر یہ الٹا پڑ جاتا ہے تو اس سے ان کو کیا حاصل ہو گا۔

جو لوگ ہمارے انکاؤنٹر کی تحقیقات کر رہے ہیں ذرا ان پر ایک نظر ڈالو۔ کرنیل

سوال: کیسے کرتا ہے وہ ایسا کہ اس کا کچھ نہیں ہوتا اور بچا رہتا ہے۔ بشمول آپ کے معاملے کے، اس معاملے میں آخر اس کا نام کیوں نہیں آیا ہے؟

جواب: کیوں کہ سیدھے سیدھے پورے معاملے میں کہیں ظاہر نہیں ہوتا ہے۔ وہ بس افسروں کو احکامات صادر کرتا ہے۔

سوال: ایک ہی معیار کے مطابق اگر آپ کے معاملے میں امت شاہ کی گرفتاری ہوئی تو پھر وزیر اعلیٰ کی گرفتاری بھی ہونی چاہیے تھی۔

جواب: ہاں۔

۲۰۰۷ء میں سہراب الدین کے انکاؤنٹر کے معاملے میں افسروں کی گرفتاری کے معاً بعد سونیا گاندھی یہاں آئی تھی اور اس نے افسروں کو 'موت کے سوداگر' کہا تھا۔ اس کے بعد مودی ہر میٹنگ میں چلاتا پھر رہا تھا: 'موت کے سوداگر؟ سہراب الدین کون تھا، اس کو مارا تو اچھا ہوا کہ نہیں ہوا؟' اور اسی کے بعد اس کو بھاری اکثریت حاصل ہوگئی تو دیکھو اس کو جو چیز چاہیے تھی وہ مل گئی۔

سوال: اور جن افسروں سے اس نے یہ کام کروایا اب ان کی مدد یہ نہیں کر رہا ہے؟

جواب: نہیں، وہ سب کے سب جیل میں ہیں۔

سوال: کبھی اس نے آپ سے آپ کے انکاؤنٹروں کے بارے میں سوال کیا؟

جواب: نہیں۔ اس نے کبھی نہیں کیا۔ دیکھو ان کو سب کا فائدہ لینا ہوتا ہے۔ فسادات ہوئے مسلمانوں کو مارا۔ فائدہ لیا۔ اس پر بھی لیا۔

سوال: لیکن آپ کے شاہ صاحب کیا دوبارہ وزارت داخلہ میں واپس آسکیں گے؟

جواب: نہیں۔ اب نہیں آپائے گا کیوں کہ وزیر اعلیٰ کو اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ہوم ڈپارٹمنٹ میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔ وہ سرکار کی کمزوریوں کو جانتا ہے۔ اس لیے وزیر اعلیٰ یہ نہیں چاہے گا کہ کوئی وزیر داخلہ سب کچھ جانتے ہوئے اس عہدے پر

برقرار رہے۔

سوال: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ اور وزیر داخلہ دونوں میں اب اتفاق نہیں ہے؟

جواب: نہیں۔ یہ وزیر اعلیٰ مودی جیسا کہ ابھی تم نے کہا، وہ موقع پرست ہے۔ اپنا کام نکال لیا۔ سب کام اپنا کروالیا۔

سوال: اپنے گندے کام؟

جواب: ہاں۔

سوال: تو اس کے علاوہ آپ نے کتنے انکاؤنٹر کیے ہیں؟

جواب: ہم م م م۔۔۔ تقریباً۔ دس شاید۔

سوال: سب کے سب مشہور والے۔ کیا میں جان سکتی ہوں؟

جواب: نہیں نہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ان دنوں فرضی انکاؤنٹروں کے بارے میں جاری تحقیقات کی خبریں گجرات کے تقریباً تمام روزناموں میں شہ سرخیوں میں رہتی تھیں، مجھے جواز مل گیا تھا کہ میں سنگھل سے تفصیلی سوالات پوچھ سکوں اور کسی طرح کا شک بھی پیدا نہ ہو۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور سنگھل سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا مجھے لگا کہ وہ احساس جرم میں جی رہا تھا۔ مجھے اس سے ایک قسم کی ہمدردی ہونے لگی تھی۔ کیا واقعی وہ بے گناہ تھا جیسا کہ مجھے باور کرانا چاہتا تھا جو سسٹم کے ظلم کا مارا تھا۔ وہ مجھے مختلف فلمی کرداروں کی تمثیلیں دے کر اپنی صورت حال کی تصویر کشی کرتا تھا۔ گفتگو کرتے کرتے بھاگوت گیتا کے شلوک پڑھتا اور دھرم کا حوالہ دیتا۔ ہم اوشو پر بات کرتے۔ حتیٰ کہ میری سگریٹ پینے کی عادت بھی موضوع سخن بنتی۔ 'اگر چھوڑ سکو تو سگریٹ پینا چھوڑ دو۔ یہ اچھی چیز نہیں ہے۔' وہ کہتا۔ مجھ سے اس کی دوستی گہری ہونے لگی تھی۔ میں ایک غیر تھی جس کا کام اپنوں کی طرح اس کے بارے میں فیصلہ کرنا نہیں تھا۔

صحیح معنی میں میں اندازہ نہیں لگا پائی کہ آخر یہ آدمی کیا ہے؟ ایک دن جب میں لوٹ کر ہاسٹل پہنچی تو سیدھے پی سی او گئی۔ میں بڑی الجھن میں تھی اور اسی لیے فیصلہ کیا کہ اماں سے پوچھنا چاہیے۔ سنگھل سے مجھے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے اندر ان افسروں کی طرح رعونت نہیں تھی جن سے میں پہلے مل چکی تھی۔ وہ ان افسروں کی طرح سفاکانہ قتل اور انکاؤنٹروں کے بارے میں شیخی نہیں بگھارتا تھا۔ لیکن اگر کوئی سفاکانہ قتل کا حصہ رہا ہے، یا اگر وہ ایسا افسر ہے جو سچ پر پردہ ڈالے بیٹھا ہے تو اس کے اس عمل کی اخلاقی توجیہ ممکن نہیں ہو سکتی۔ میری ماں نے اس دن مجھ سے کہا کہ لوگ اپنے رویے اور اپنے اعمال کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے ہزار صفائیاں دیتے ہیں۔ تمہارا کام بس یہ ہے کہ جا کر دیکھو کہ انھوں نے کیا کیا ہے۔ تب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ان کی صفائی میں کتنا وزن ہے۔

یہ بات صاف تھی کہ برسوں تک اپنا منہ بند رکھنے کی وجہ سے سنگھل بھی جرم میں اتنا ہی شریک تھا جتنا کہ دیگر افسر۔ تاہم اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کس طرح ریاستی انتظامیہ دھڑلے سے اس قسم کے بے بس افسروں کا استعمال کرتا ہے۔ 'استعمال کرو اور چھوڑ دو' والی پالیسی کی بات جس کا سنگھل نے ذکر کیا تھا اور جسے میرے خفیہ کیمرے نے قید کر لیا تھا، برسوں بعد دوبارہ اس وقت اُٹھی جب ایک اور اعلیٰ پولیس افسر ڈی جی ونجارا نے بھی ایسی ہی شکایت کی۔ ونجارا مودی جتھے کے ان اعلیٰ ترین افسروں میں سے ایک ہے جو چار فرضی انکاؤنٹروں میں اپنے رول کی وجہ سے سلاخوں کے پیچھے ہے۔ اس نے گجرات ریاستی حکومت کو لکھے گئے اپنے خط (٦) میں ان تمام باتوں کا اعادہ کیا تھا جس کے بارے میں سنگھل نے بتایا تھا۔ یہ حقیقت بیان کی کہ اس جیسے افسروں کا استعمال امت شاہ جیسے وزرا کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا جاتا ہے اور وہ انسان جس کو وہ اپنا خدا سمجھ بیٹھا تھا، یعنی وزیر اعلیٰ نریندر مودی، اس نے اس کو دھوکہ دیا ہے۔ ونجارا (جس نے ریاستی پولیس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے) کے بیان کے پیچھے

کوئی سیاسی محرک ہے یا نہیں یہ بات پردۂ ابہام میں ہے۔ البتہ یہ حقیقت مسلّم ہے کہ اس کے اور سنگھل جیسے بہت سے افسروں کا استعمال اس قربان گاہ پر کیا گیا جس کے بارے میں اب 'دہشت سے آزاد ریاست' ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

سنگھل کوئی استثنا نہیں تھا بلکہ وہ معمول کا حصہ تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا انکشاف مجھ پر آنے والے دنوں میں ریاست کے ایک سابق پولیس کمشنر راجن پریادرشی اور دیگر افسروں کے ذریعے ہونے والا تھا۔ سچائی کی جستجو کی یہ بس ایک شروعات تھی۔



باب چہارم

راجن پریادرشی

کارپوریٹ کی زبان میں ایک اصطلاح بولی جاتی ہے جس کو 'ٹیک اوے' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی کانفرنس، میٹنگ یا بات چیت کا نفع بخش حاصل۔ اتفاق سے راجن پریادرشی میرے لیے ایک اتفاقی 'ٹیک اَوے' تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ میری غیب سے مدد تھی۔ ایسا میں اس لیے کہہ رہی ہوں کیوں کہ اس سبکدوش پولیس افسر نے میری تفتیش کی قدر وقیمت میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں یہ اعتراف بھی کرتی چلوں کہ راجن پریادرشی نامی پولیس افسر سے میرا سابقہ اس وقت تک نہیں پڑا تھا۔ اگر اس کے جونیئر گریش سنگھل نے گفتگو کے دوران اس کا ذکر نہ چھیڑا ہوتا تو شاید اس کے بارے میں کبھی پتہ بھی نہ چلتا۔ میں نے گجرات سے خاصی رپورٹنگ کی تھی اور اس لیے وہاں کے اکثر پولیس افسروں سے واقف تھی یا شاید میں ایسا سمجھتی تھی۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن سے میری ملاقات تو نہیں ہوئی تھی لیکن پولیس برادری کے ساتھ انٹرویو اور ان کے بارے میں اخباری رپورٹوں کی وجہ سے اتنا تو ضرور تھا کہ متعلقہ افسران کے بارے میں میرے پاس اچھی خاصی معلومات یکجا ہو گئی تھیں۔

لہٰذا جب سنگھل نے اس نام کا ذکر کیا جس سے میں قطعی طور پر ناواقف تھی تو یہ میرے لیے باعث حیرت تھا۔ اس سے ملاقات کے لیے جانے سے قبل تک اس کے بارے میں میرے پاس بالکل کوئی تحقیقات موجود نہیں تھیں۔ میں اس سے ملنے صرف اس وجہ سے گئی تھی تاکہ سنگھل کے ذہن میں کوئی شک پیدا نہ ہو نیز اس کو اس بات کی تسلی بھی ہو جائے

کہ میں تندہی سے اپنا کام انجام دے رہی ہوں۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سنگھل کا اعتماد مجھ پر بڑھ گیا کیوں کہ اسے لگا کہ میں دیگر پولیس افسران سے بھی مل رہی ہوں۔ خاص طور پر ان افسران سے جو غیر متنازع رہے ہیں اور سرخیوں سے پرے بھی۔ راجن پریادرشی کی زندگی کے بارے میں ایک دل چسپ پہلو اور بھی تھا۔ جون ۲۰۰۴ء میں ٹائمس آف انڈیا کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں ۱۹۸۰ء کی کھیپ کے اس آئی پی ایس افسر پریادرشی نے کہا تھا کہ ریاست کے ایک اعلیٰ ترین افسر ہونے کے باوجود اس کے گاؤں میں اس کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا میں شائع رپورٹ نے لکھا تھا:

> مختلف طبقہ ہائے حیات کے لوگ اپنے بے شمار مسائل کے حل کے لیے دست بستہ میرے پاس آتے ہیں، لیکن جب وہی پریادرشی دیہگام تعلقہ میں واقع اپنے آبائی گاؤں کا دگرا جاتا ہے تو حیرت انگیز طور پر نوعیت بدل جاتی ہے۔
>
> یہی اعلیٰ پولیس افسر آج بھی اس علاقے میں اپنے لیے ایک گھر تک نہیں خرید سکتا جہاں گاؤں کے اونچی ذاتوں کے لوگ رہتے ہیں۔ آج بھی اس کا گھر کادگرا کے دلت واس میں ہی واقع ہے۔ اگرچہ پریادرشی اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتے لیکن ذرائع کا کہنا ہے کہ گزشتہ سال تک گاؤں کا حجام بھی دلت گاہک کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

اگر تکنیکی طور پر بات کی جائے تو فلم کے نقطۂ نظر سے اس نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ تحقیقات کے اختتام تک خاصا مواد اکٹھا ہو گیا تھا جس سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ افسران کی اکثریت جن کا حکومت نے پہلے استعمال کیا اور پھر ان کے ساتھ بد سلوکی سے پیش آئی پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن ایک اور اہم بات تھی جو مجھ سے چھوٹ رہی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ ۲۰۰۷ء میں جب گجرات سی آئی ڈی نے فرضی انکاؤنٹر معاملوں میں تحقیقات کا آغاز کیا تھا تب راجن پریادرشی گجرات اے ٹی ایس کے ڈائرکٹر جنرل ہوا

کرتے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں، وہ ۲۰۰۲ء کے فسادات کے دوران راجکوٹ کے آئی جی جیسے نہایت اہم عہدے پر بھی فائز رہ چکے تھے۔

بہر کیف میں مائیک کے ہم راہ راجن پریادرشی سے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم اس ساٹھ سے کچھ زائد عمر کے شخص سے اپنی پہلی ملاقات کو کبھی بھول پائیں گے۔ ان کا یک منزلہ بنگلہ احمد آباد میں نرودا پٹیا کے ایک ایسے علاقے میں واقع تھا جہاں متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ یہ وہی انتخابی حلقہ ہے جہاں سے ہماری تحقیقات کی ایک دیگر سبجیکٹ مایا کوڈنانی، ایم ایل اے منتخب ہوئی تھی۔ یہی وہ علاقہ بھی ہے جہاں فرقہ وارانہ فسادات کا چہرہ سب سے زیادہ بھیانک ہو گیا تھا اور کثیر تعداد میں جانیں لی گئی تھیں۔

پریادرشی کا گھر تلاش کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ ۳۰ برسوں سے زیادہ مدت تک گجرات کے طول و عرض میں بعض اہم ترین عہدوں پر فائز رہ چکے ایک سابق اے ٹی ایس سربراہ کے لیے یہ محل وقوع قدرے معمولی محسوس ہوا۔ ان کے گھر تک پہنچنے کے لیے ایک سرکاری اسکول، بہت ساری جھونپڑیوں اور نالوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بہت سے لوگ تو ان کے وجود سے بھی بے خبر تھے۔ البتہ پاس پڑوس کے لوگ انھیں ایک پولیس والے کے طور پر اس لیے جانتے تھے کیوں کہ انھوں نے اپنا فوٹو فریم کروا کر اپنے گھر کے دروازے پر لگا رکھا تھا۔

پریادرشی بڑی بے صبری سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہماری ٹیکسی ان کی گلی میں داخل ہوئی وہ ہاتھ ہلا کر ہمیں اشارہ کرنے لگے۔ اور اپنے گھر کی پہلی منزل سے ہی چہکتے ہوئے خوش آمدید خوش آمدید کی صدا بلند کرنے لگے۔ ہم دونوں ان کے گھر میں داخل ہوئے جو غیر معمولی طور پر سادگی کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ٹھیک دروازے کے پاس ہی ایک کتبہ تھا جس پر ان کے ان عہدوں کی تفصیلات درج تھیں جن پر پریادرشی اپنی ملازمت کے دوران فائز رہے تھے۔ جب ہم اندر گئے تو ایک پرجوش اور زندہ دل شخص نے ہم سے مصافحہ

کیا۔ گاؤں کے پہلوان جیسی ان کی مونچھ اور سفید ہوتی ہوئی ڈاڑھی تھی۔ دو سوتی شالیں، قلم اور نوٹ بک ہمیں دیے گئے۔

وہاں پہنچنے کے بعد کچھ منٹوں تک جو کچھ ہوا وہ بہت پر لطف تھا۔ پریادرشی کو مائیک فوراً ہی پسند آگیا۔ لیموں پانی لایا گیا۔ بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال ہو رہا تھا اس عالم حیرانی سے ہم ابھی باہر بھی نکل نہیں پائے تھے کہ ۳۰ سے کچھ زائد عمر کا ایک شخص ایک دس سالہ لڑکے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ پریادرشی کا بیٹا اور پوتا تھے۔ آخرالذکر نے اپنے ہاتھ میں ڈیجیٹل کیمرہ لے رکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ روز روز غیر ملکی فلم ساز ہمارے گھر تو نہیں آئیں گے۔ یہ ہمارے لیے باعث شرف ہے۔ براہ مہربانی ہمارے ساتھ ایک فوٹو گراف کھنچوا لیجیے۔

جب آپ انڈر کور ہوں تو ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیں گے جس سے آپ لوگوں کی نظر میں آجائیں اور نہ ہی اپنی اصلیت کا کوئی نشان پیچھے چھوڑیں گے۔ لیکن اس صورت حال میں فوٹو کھنچوانے سے انکار کرنا بھی درست نہیں تھا۔ مزید یہ کہ دروازے پر موجود کتبے پر درج پریادرشی کی مدت ملازمت کے گراف پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مائیک اور میں نے اس کے پوتے کی خواہش پر دو چار فوٹو کھنچوائے۔ پھر ہمیں پریادرشی کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ریاستی اور کابینی وزرا اور سابق وزیراعظم راجیو گاندھی کے ساتھ پریادرشی کی ایک تصویر رہائشی کمرے میں آویزاں تھی۔

جسارت کا ثبوت دیتے ہوئے میں نے پوچھ ہی لیا: 'سر، کیا آپ ہمارے فوٹوؤں کو بھی فریم کرانا چاہتے ہیں۔' دراصل میں یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ آخر کس مقصد کے لیے ہمارے ساتھ فوٹو کھنچوائے گئے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ ماہانہ طور پر ایک مقامی اخباری ضمیمہ شائع کرتے ہیں اور اپنے جاننے والوں کے درمیان اس کی تقسیم مفت کرواتے ہیں۔ یہ سن کر سکون ملا اور اس یقین دہانی کے ساتھ ہم نے اس گفتگو کو ختم کر دیا کہ ان فوٹوؤں کا استعمال وہ صرف تب کریں گے جب گجرات میں موجود لوگ ہماری فلم کے موضوع سے متعارف

ہو جائیں گے۔ 'آپ تو جانتے ہیں سر کہ ہم غیر ضروری توجہ کا مرکز بننا نہیں چاہیں گے۔ ہم ذرا لو پروفائل ہی رہنا چاہتے ہیں۔' میں نے گزارش کی تو وہ بھی بخوشی راضی ہو گئے۔

ان کی گفتگو کی نوعیت خود کلامی کی سی تھی۔

ایک گھنٹے کے وقفے کے دوران ہمیں یہ محسوس ہوا کہ پریادرشی نے اتنا مواد فراہم کرا دیا ہے کہ ان کی مختصر سوانح حیات تیار کرنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ ہر معنی میں وہ ایک کردار تھا۔ ایک ایسا کردار جس کی جھلک آپ کو کسی فلم یا ناول میں ملتی ہے۔ لیکن اس ملاقات سے ہمیں کچھ ایسی اہم اور کام کی باتیں معلوم ہوئیں جن سے ریاستی مشینری کے طریق کار کا پتہ چلتا تھا۔ جب انھوں نے تفصیل سے گاؤں کے اس حجام کے بارے میں بتایا جس نے بال کاٹنے سے انکار کر دیا تھا اور اس لیے مجبوراً دلت نواس میں ہی انھیں ایک گھر بنوانا پڑا تو ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کے ساتھ ہو رہا تھا جو گجرات سرحد رینج کے آئی جی کے عہدے پر فائز تھا۔ دلت شناخت برابر انھیں پریشان کیے رہی۔ گجرات پولیس فورس میں اپنی مدت ملازمت کے دوران کئی موقعوں پر انھیں اپنے سینئر افسران کے ذریعے ڈرٹی ورک کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ لیکن انھوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ 'یہ بات بڑی عجیب تھی۔ گویا اگر آپ دلت ہیں تو آفس کا کوئی بھی آدمی آپ کو کچھ بھی کہہ دے۔ کوئی عزت نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ایک دلت افسر سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ بے رحمانہ قتل کا ارتکاب کرے کیوں کہ (بظاہر) اس کی نہ کوئی عزت نفس ہے اور نہ ہی کوئی آئیڈیل ہے۔ گجرات پولیس میں صرف اونچے طبقے کے لوگوں کی ہی ہر جگہ پذیرائی ہوتی ہے۔'

جیسے جیسے ہماری ملاقات آگے بڑھی ویسے ویسے پریادرشی کا اضطراب بڑھتا رہا۔ لیکن تب تک تو وہ بہت کچھ کہہ چکے تھے۔ ہماری تیسری ملاقات کے لیے میں ان سے تنہا ہی ملنے گئی۔ اس دفع میں نے مائیک کو آرام دینے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وہ مایا کوڈنانی کے آفس جا کر ہماری

شوٹنگ کی خاطر معائنہ کر آئے۔ اس کا مشورہ مائیک نے خود ہی دیا تھا۔ اس نے کہا تھا: 'کیا ہم کچھ ایسا نہ کریں جس سے ان لوگوں کو یقین آجائے کہ ہم سچ مچ فلم ساز ہیں؟' کوڈنانی کے اسٹاف کے لوگ اسے گردوپیش کا معائنہ کروانے کے لیے ضرورت سے زیادہ پرجوش تھے۔ شام کے وقت مایا کوڈنانی کا ایک پیغام آیا: 'کیا ہمیں گھر کی کوئی خاص جگہ درکار ہے؟ اور کیا اس کے ہاتھ سے بنے دوپہر کے کھانے کے لیے اتوار کو آنے میں ہمیں دل چسپی ہوگی؟' میں نے فوراً ہی جواب لکھ کر بھیج دیا 'ہاں۔'

اس دن جب میں پریادرشی سے ملنے پہنچی تو دیکھا کہ وہ اس اخبار کے نسخے چھانٹ کر الگ کیے ہوئے ہیں جس کو وہ شائع کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان میں سے جو چاہے آپ لے سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے پاس میرے بارے میں اب ساری معلومات ہیں۔ آپ شوٹنگ کب شروع کر رہی ہیں؟ وہ گھبرائے ہوئے اور پریشان لگ رہے تھے۔ زبان حال سے اس کا صاف پتہ چل رہا تھا۔ انھوں نے کچھ زیادہ ہی انکشاف کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ ان کو بھی تھا۔ اس دور کی ساری تفصیلات انھوں نے بتائی تھیں جب وہ ریاستی اے ٹی ایس کے سربراہ کے عہدے پر فائز تھے۔ دیر رات وزیر داخلہ امت شاہ کے ساتھ اس کے بنگلے پر اپنی خفیہ میٹنگ کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہی امت شاہ جس نے ان سے ایک بار حراست میں موجود ایک ملزم کو مار ڈالنے کو کہا تھا۔ جتنی بار بھی میں راجن پریادرشی سے ملتی تھی مجھے لگتا تھا کہ ہر بار اپنے ساتھ کچھ مزید لے کر ہی واپس لوٹتی تھی۔

سوال: آپ کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی یہاں گجرات میں بہت مقبول ہیں؟

جواب: ہاں، وہ لوگوں کو بے وقوف بناتا ہے اور لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔

سوال: اگر ایسا ہے تو پھر بطور اڈیشنل ڈی جی اس کی ماتحتی میں کام کرنے میں آپ کو بہت دشواری ہوئی ہوگی؟

جواب: کبھی کبھی ہوتی تھی ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچھ ناجائز کام کرنے کے لیے وہ

ہمیں مجبور کر دیں۔

سوال: لا قانونیت تو یہاں عام ہے۔ ہے نا؟ کوئی سیدھا سچا افسر ملنا مشکل ہے؟

جواب: بہت تھوڑے ایسے لوگ ہیں۔ یہ آدمی نریندر مودی پوری (ریاست) میں مسلمانوں کے قتل کا ذمہ دار رہا ہے۔

سوال: اچھا، میں نے سنا ہے کہ افسران بھی حکومت ہی کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے؟

جواب: ہاں سب کے سب، جیسے کہ یہ پی سی پانڈے، سب کچھ ان لوگوں کی موجودگی میں ہوا۔

سوال: اکثر افسران کہتے ہیں کہ ان کو غلط طریقے سے پھنسایا گیا ہے؟

جواب: غلط طریقے سے کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے خود کیا تھا اس لیے اب وہ سلاخوں کے پیچھے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک نوجوان لڑکی کو انکاؤنٹر میں مار ڈالا تھا۔

سوال: کیا واقعی؟

جواب: ہاں، یہ لوگ اس لڑکی کو لشکر دہشت گرد کہتے ہیں۔ وہ ممبرا کی رہنے والی تھی۔ کہانی رچی گئی تھی کہ وہ ایک دہشت گرد تھی اور گجرات میں مودی کو مارنے کے لیے آئی تھی۔

سوال: جب کہ یہ بات بے بنیاد بات ہے؟

جواب: ہاں، بالکل بے بنیاد بات ہے۔

سوال: میں جب سے یہاں آئی ہوں ہر کوئی سہراب الدین انکاؤنٹر کے بارے میں بات کر رہا ہے؟

جواب: پورا ملک اس انکاؤنٹر کی بات کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے سہراب الدین اور تلسی پرجاپتی کو وزیر کے اشارے پر راستے سے ہٹا دیا تھا۔ یہ وزیر امت شاہ جو ہے نا اسے کبھی انسانی حقوق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگوں سے وہ کہا کرتا تھا کہ میں

ان انسانی حقوق کمیشنوں میں اعتماد نہیں رکھتا ہوں۔ اور اب اس کو دیکھو۔ عدالتوں
نے اس کو بھی ضمانت دے دی ہے۔

سوال: تو کیا آپ نے اس کی ماتحتی میں کبھی کام نہیں کیا؟

جواب: کیا تھا، جب میں اے ٹی ایس کا سربراہ ہوا کرتا تھا، ونجارا کو منتقل کرا کے اس کی جگہ مجھے لایا گیا تھا۔ اور میں ایک ایسا آدمی ہوں جو انسانی حقوق میں اعتقاد رکھتا ہے۔ یہ شاہ مجھے اپنے بنگلے پر بلاتا ہے۔ اب چوں کہ میں کبھی کسی کے بنگلے پر نہیں گیا ہوں۔ ناہی کسی کے گھر یا آفس میں گیا ہوں تو میں نے اس سے کہہ دیا: 'سر، میں نے آپ کا بنگلہ نہیں دیکھا ہے۔' یہ سن کر وہ بھونچکا رہ گیا اور پوچھنے لگا کہ آپ نے میرا بنگلہ کیوں نہیں دیکھا ہے؟ پھر بولا کہ ٹھیک ہے میں اپنی ذاتی گاڑی آپ کے لیے بھیجوں گا، آپ اس میں آئیں، لہٰذا جب میں وہاں پہنچا تو کہنے لگا: 'اچھا آپ نے ایک بندہ کو اریسٹ کیا ہے نا، جو ابھی آیا ہے اے ٹی ایس میں، اس کو مار ڈالنے کا ہے۔'

میں نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ تو وہ پھر بولا: 'دیکھو مار ڈالو، ایسے آدمی کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'

میں فوراً اپنے دفتر میں آیا اور اپنے ماتحت افسران کی ایک میٹنگ منعقد کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ امت شاہ بلاواسطہ ان لوگوں کو احکام جاری کر کے اس شخص کو مروا دے گا، اس لیے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس کو مارنے کے احکامات مجھے دیے گئے ہیں۔ لیکن کوئی بھی اس کو ہاتھ نہیں لگائے گا بس اس سے پوچھ تاچھ کرو، مجھے کہا گیا ہے لیکن میں یہ نہیں کر رہا ہوں اس لیے تم بھی ایسا کرنے کے پابند نہیں ہو۔

سوال: یہ تو ایک طرح کی بہادری تھی؟

جواب: جس دن میں سبک دوش ہو رہا تھا نریندر مودی نے مجھے بلا کر پوچھا کہ اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اس طرح کے اور بھی سوالات کیے۔ میں نے اس سے کہا کہ کس طرح

مجھے دبایا گیا تھا۔ پھر وہ بولا کہ 'اچھا یہ بتاؤ۔ سرکار کے خلاف کون کون لوگ ہیں۔ میرا مطلب کتنے افسر سرکار کے خلاف ہیں۔'

تب میں نے مودی سے پوچھا: 'کیا مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت ہے؟' اس نے کہا: 'پوچھو۔'

میں نے پوچھا: 'پچھلی دو دہائیوں میں مختلف حیثیتوں سے میں نے اپنی خدمات انجام دی ہیں کیا میرے خلاف آپ نے کبھی بھی کچھ سنا ہے۔' اس نے کہا کہ میں بہت اچھا کام کرتا ہوں۔ لہٰذا میں نے کہا: 'سر، اگر ایسا ہے تو پچھلے چار سالوں سے میرے اے سی آر (ACR) کو خود میرے سینئر افسران اور داخلہ سکریٹریوں نے زبردست اور ممتاز قرار دیا ہے تو پھر آپ نے ان اے سی آر کا درجہ کیوں گھٹا دیا؟ میری کارکردگی کو آپ کے ذریعے کمتر کیوں گردانا گیا؟' میں نے اس سے کہا کہ میں نے یہ ساری معلومات آر ٹی آئی کے ذریعہ یکجا کی ہیں۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے افسران اور داخلہ سکریٹریوں کو فون نہیں کرتا ہوں۔ میں نے کہا: 'سر آپ کو داخلہ سکریٹریوں کو فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو سب پتہ تھا کیوں کہ فائل آپ کے پاس آئی تھی۔'

دراصل میں ڈی جی بن سکتا تھا لیکن اس نے مجھے بننے نہیں دیا۔

سوال: تو آپ کی ریاست میں کوئی ڈی جی کیوں نہیں ہے؟

جواب: کیوں کہ کلدیپ شرما نامی ایک افسر سے مودی کو انتقام لینا ہے۔

سوال: اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے پاس افسران کی اپنی ٹیم ہے؟

جواب: آپ جانتی ہیں جب میں راجکوٹ کا آئی جی پی تھا تو جونا گڈھ کے پاس فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے۔ میں نے کچھ لوگوں کے خلاف ایف آئی آر درج کیے۔ وزیر داخلہ نے فون کر کے مجھ سے کہا: 'راجن جی آپ کہاں ہیں؟' میں نے کہا: 'سر

میں جوناگڈھ میں ہوں۔' تو اس نے کہا: 'اچھا تین نام لکھیے اور ان تینوں کو گرفتار کیجیے۔' میں نے کہا: 'سر، یہ تینوں میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میں آپ کو بتادوں، سر، کہ یہ سب مسلمان ہیں اور انھیں کی وجہ سے حالات کو معمول پر لایا جاسکا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنی کوششوں سے ساتھ لائے ہیں اور فسادات ختم کروائے ہیں۔' تو اس نے کہا کہ دیکھو سی ایم صاحب نے کہا ہے اور اس وقت یہی آدمی نریندر مودی سی ایم تھا۔ (اور اس نے مجھ سے کہا) کہ یہ سی ایم کا آرڈر ہے۔ میں نے کہہ دیا: 'سر اگر یہ سی ایم کا آرڈر ہو تب بھی میں یہ نہیں کروں گا کیوں کہ یہ تینوں بے قصور ہیں۔'

سوال: فون پر آپ سے کون بات کر رہا تھا؟

جواب: وزیر داخلہ گوردھن زدافیا تھا۔

سوال: یہ کب کی بات ہے؟

جواب: تقریباً جولائی ۲۰۰۲ء کی بات ہے۔ پھر زدافیا نے کہا تھا کہ وہ خود ہی آئے گا۔

سوال: تو یہ کون لوگ تھے؟

جواب: ارے۔ وہ اچھے لوگ تھے۔ مسلمان تھے۔ وہ لوگ جو اصل میں فسادات ختم کروانے میں مدد کر رہے تھے۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ان لوگوں کو گرفتار کرلیتا۔

سوال: سنگھل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اسی نے آپ سے بات کرنے کے لیے کہا تھا؟

جواب: میں اس کا باس تھا۔ ابھی وہ اے ٹی ایس میں ہے۔ ڈپٹی ایس پی کے طور پر میری ماتحتی میں کام کرتا تھا۔

سوال: تو کن لوگوں نے اس کی ماتحتی میں کام کیا ہے؟

جواب: جو لوگ جیل میں ہیں ان میں سے۔ مثلاً ونجارا اس کی ماتحتی میں تھا۔ جب میں بارڈر رینج کا آئی جی تھا، تو انھوں نے میری بدلی کروادی کیوں کہ انھیں ونجارا کو لانا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے عہدے کو بھی کم کیا تاکہ اس کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔

سوال: تو کیا یہاں کی پولیس مسلمان مخالف ہے؟

جواب: نہیں۔ دراصل یہ سیاسی لیڈران ایسے ہیں۔ اگر کوئی افسران کی نہیں سنتا ہے تو یہ ایسے افسروں کو سائڈ پوسٹنگ پر بھیج دیتے ہیں۔ اب وہ کیا کریں؟

سوال: امت شاہ نے جس آدمی کو راستے سے ہٹانے کے لیے آپ سے بولا تھا کیا وہ مسلمان تھا؟

جواب: نہیں، وہ اس کو اس لیے ہٹانا چاہتا تھا کیوں کہ بزنس لابی کی طرف سے دباؤ تھا۔ دیکھیے، یہ میرے اور آپ کے درمیان کی بات ہے۔ ایک زمانہ میں یہ لوگ ونجارا اور اس کی ٹولی نے پانچ سرداروں کو گرفتار کیا تھا، ان میں سے ایک کانسٹبل بھی تھا ونجارا نے کہا کہ ان کو انکاؤنٹر میں مار ڈالنا چاہیے کیوں کہ یہ دہشت گرد ہیں۔ قسمت سے پانڈیان اس زمانہ میں ایس پی ہوا کرتا تھا اور اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا وہ پانچوں (معصوم) بچ گئے۔

سوال: لیکن افسران واقعی مسلم مخالف نہیں ہیں؟

جواب: نہیں، وہ نہیں ہیں۔ سیاسی لیڈران ان کو یہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر آپ راست باز ہیں تو وہ کبھی بھی آپ کو ایک عہدے پر رہنے نہیں دیں گے۔ دیکھیے ان لوگوں نے رجنیش رائے اور راہل شرما کا کیا حال کیا ہے۔

یہ ایک فرقہ پرست اور فاسد حکومت ہے۔ جیسے کہ یہ امت شاہ آکر فخر سے بیان کرتا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں فسادات بھڑکانے کے لیے اس نے کیا کچھ کیا۔ وہ ہر آدمی کو اپنے گھر بلاتا تھا، اسی طرح کی ایک میٹنگ میں اس نے داخلہ سکریٹری، چیف

سکریٹری اور ایک ایم پی (رکن پارلیمنٹ) کو بلایا، مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ اس زمانے میں میں بحیثیت آئی جی خدمات انجام دے رہا تھا۔ ایم پی نے امت شاہ سے کہا کہ تم ایک کانسٹبل کا بھی تبادلہ نہیں کر سکتے؟ امت شاہ میری طرف مڑ کر کہنے لگا: 'یہ کیوں نہیں ہوا؟'

مجھے پلٹ کر کہنا پڑا کہ کانسٹبل نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ وہ بس بی جے پی ایم پی کے بیٹے کو روک رہا تھا۔

سوال: لیکن مجھے حیرانی ہوئی کہ اس نے آپ سے کہا؟

جواب: وہ مجھ سے رازداری کی باتیں کیا کرتا تھا۔ درحقیقت اس نے مجھے عشرت معاملے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے پہلے عشرت کو حراست میں رکھا تھا بعد میں سب مارے گئے تھے۔ اور پانچوں کے پانچوں مارے گئے تھے۔ ان کا کوئی انکاؤنٹر نہیں ہوا تھا وہ مجھ سے کہتا تھا کہ وہ دہشت گرد نہیں تھی۔

سوال: مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے آپ کو اے ٹی ایس میں رہنے دیا جو اتنا اہم عہدہ تھا؟

جواب: ہاں۔ وہ لوگ سوچتے تھے کہ میں ان کا آدمی ہوں اور ویسا ہی کروں گا جیسا وہ کہیں گے۔ اس لیے شاہ نے مجھ سے کہا کہ دیکھو ہمارے پاس دو اہم عہدے خالی ہیں۔ ایک اے ٹی ایس اور دوسرا کمشنر آف پولیس کا عہدہ۔ اور ان دونوں عہدوں پر ہمیں اپنے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم آشیش بھاٹیا کو کمشنر آفس پولیس بنارہے ہیں اور تم کو اے ٹی ایس کا سربراہ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دیکھو ہم کو تم پر اعتماد ہے کہ تم ویسا ہی کروگے جیسا کہ سرکار تم کو کرنے کو کہے گی، میں نے کہا کہ اگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے تو مجھے کمشنر آف پولیس کیوں نہیں بناتے ہیں؟

پی سی پانڈے کو دیکھیے اس نے فسادات کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

اس پر تو مقدمہ چلنا چاہیے تھا۔ لیکن اس پر وزیر اعلیٰ کی نوازش ہے۔ وہ اس کا چہیتا ہے اس لیے دیکھیے سبکدوشی اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اس کو عہدے سے نوازا گیا۔ اگر چہ میرے اس کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ غلط ہے۔

مئی ۲۰۱۳ء کے کسی وقت کی بات ہے کہ عشرت جہاں فرضی انکاؤنٹر معاملے میں میری تحقیقات گجرات انتظامیہ پر بم بن کر گری تھیں، عشرت اور صادق جمال فرضی انکاؤنٹر معاملے کی ایک اہم ترین دستاویز میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ تحقیقات نے وزارت داخلہ کو ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ نیوز چینلوں پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ ہر نیوز چینل پر میں موجود تھی اور تحقیقات کی تفصیلات کی وضاحت کر رہی تھی۔ فرضی انکاؤنٹر کے معاملے میں شاید پہلی بار ایک بلاواسطہ کڑی اینٹلی جنس افسران سے ثابت کی گئی تھی اس بار منصوبے کو انجام دینے والا دماغ راجندر کمار کا لگ رہا تھا۔ یہ ایک مرکزی آئی بی افسر تھا جس کی تقرری گجرات میں تھی۔

انکشاف سرخیوں میں تھا اور وزارت داخلہ دفاعی پوزیشن میں آگئی تھی۔ سی بی آئی کو مجبوراً آئی بی افسر سے پوچھ تاچھ کرنی پڑی۔ بالخصوص اسپیشل آئی بی ڈائریکٹر راجندر کمار سے پوچھ گچھ کی گئی۔ جس کا رول عشرت انکاؤنٹر میں ثابت کیا جا چکا تھا۔ (۷) ابھی حال ہی میں راجندر کمار ایک بار پھر سرخیوں میں تھا کیوں کہ سابقہ داخلہ سکریٹری جی کے پلئی جس نے اپنی مدت ملازمت میں یہ بیان دیا تھا کہ عشرت کو شک کا فائدہ دیا جانا چاہیے۔ اسی نے میڈیا کو ۲۰۱۶ء کی شروعات میں بتایا کہ راجندر کمار نے اپنا حلفیہ بیان کانگریسی حکومت کے کہنے پر بدل دیا تھا۔ اسی وجہ سے راجندر کمار سلسلے وار اپنے کئی ٹی وی انٹرویو میں یہ بیان دیتا پھر رہا تھا کہ اس کو پھنسایا جا رہا ہے۔ پلئی کے بارے میں بھی اپنی ذمہ داری ٹھیک سے ادا نہ کرنے اور اپنے مبینہ 'سچ' کے لیے جس وقت کا انتخاب انھوں نے کیا تھا اس پر سوالات کھڑے کیے گئے ہیں جب کہ اب وہ اڈانی گروپ کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں موجود ہیں۔ لیکن اس سے بھی

بُری بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا پچھتاوا نہیں ہے کہ کسی شخص کے پس منظر اور شناخت کے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انکاؤنٹر ایک غیر دستوری عمل تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اس مسئلے پر بات نہیں کی کہ آخر ایسا کیوں ہوا کہ تقریباً پورا گجرات داخلہ ڈپارٹمنٹ سنگھل کے خفیہ ٹیپ میں پکڑا گیا جو عشرت جہاں تحقیقات سے متعلق معاملے کو الجھانے کی بات کررہے تھے۔

میرے انکشاف کے پہلے ہی پیراگراف میں اس کا لب لباب کھول کر رکھ دیا تھا جس میں لکھا تھا:

سی بی آئی ۹ سال قبل گجرات پولیس کے ذریعے چار مبینہ دہشت گردوں کو غیر قانونی طریقے سے مار ڈالنے کے معاملے میں دھماکہ کرنے والی ہے۔ تہلکہ کو معلوم ہوا ہے کہ سی بی آئی احمد آباد کے ٹرائل جج کے سامنے یہ بیان دے گی کہ ایک ملزم افسر نے حلفیہ طور پر راجندر کمار کی شناخت کی ہے جو ابھی انٹیلیجنس بیورو (آئی بی) کا اسپیشل ڈائرکٹر ہے۔ اس پر الزام ہے کہ ایک عورت اور تین مرد جو سب کے سب مسلم تھے انھیں ۱۵ جون ۲۰۰۴ء کو ایک انکاؤنٹر میں مارنے کی اس نے منصوبہ بندی کی تھی۔

ایک اور دھماکے دار بات یہ ہے کہ ایک دوسرے افسر نے اپنے بیان میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ کمار ۱۹ سالہ عشرت جہاں سے اس وقت ملا تھا جب وہ پولیس کی ناجائز حراست میں انکاؤنٹر میں مارے جانے سے پہلے موجود تھی۔ ایک دوسرے پولیس افسر نے اپنے بیان میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ اے کے ۴۷ رائفل جس کے بارے میں پولیس نے کہا تھا کہ مقتولین اسے اپنے ساتھ لائے تھے وہ دراصل آئی بی کے گجرات یونٹ سے آیا تھا جس سے کمار اس زمانے میں وابستہ تھا اور اس رائفل کو چار مردہ جسموں کے اوپر پلانٹ کیا گیا تھا۔ سی بی آئی کے قبضے میں ایک خفیہ آڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہے جسے کلیدی ملزم جی ایل سنگھل نے تیار کیا تھا۔ جی ایل سنگھل ان پولیس افسروں میں شامل تھا جنھوں نے ان چاروں کو اس

منحوس رات کو مار ڈالا تھا۔ نومبر ۲۰۱۱ء میں کی گئی یہ ریکارڈنگ اس گفتگو پر مشتمل ہے جو اس وقت گجرات کے جونیئر وزیر داخلہ پرفل پٹیل، جو ایک سال پہلے شاہ کے بعد اس عہدے پر فائز ہوا تھا؛ ایڈیشنل پرنسپل سکریٹری گریش چندر مور مو آئی ایس افسر جس نے ۲۰۰۸ء سے مودی کے دفتر میں کام کیا تھا اور اس کے قریب ترین مشیر کاروں میں سمجھا جاتا تھا؛ ریاستی حکومت کے سب سے اعلیٰ قانونی افسر ایڈوکیٹ جنرل کمل تریویدی؛ اس کا نائب ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل تُشار مہتا؛ ایک بے نام وکیل؛ اور سنگھل کے درمیان ہوئی تھی۔ (پٹیل کا نام اس کے ہم نام مرکزی وزیر داخلہ کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جائے۔ پٹیل کو دسمبر کے اسمبلی انتخابات میں شکست کھانی پڑی اور مودی کے نئی کابینہ میں اس کو جگہ نہیں ملی)۔

ایسا لگ رہا تھا کہ پہیلی کے گمشدہ حصے ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں اور سارے حصے آپس میں بالکل صحیح طریقے سے بیٹھ رہے ہیں۔ پریادرشی ریاستی اے ٹی ایس کا سربراہ تھا اور امت شاہ نے اس کو یہ راز بتایا تھا کہ عشرت جہاں کو ایک بنگلے میں قید کر کے رکھا گیا تھا اور بے رحمی کے ساتھ قتل کیے جانے سے پہلے وہ حراست میں رکھی گئی تھی۔ لیکن ہر تحقیقات کی طرح اس بار بھی مجھے اس کی قیمت چکانی پڑی۔ ایسی کہانیاں تیار کی گئی جن میں میرے مذہب اور عقیدے کو میری صحافت کے ساتھ جوڑ کر دکھایا گیا۔ کچھ دنوں میں ہی مختلف چینلوں کے ایڈیٹر اور وکلا کی جانب سے میرے پاس فون آنے شروع ہو گئے کہ وزارت داخلہ کے افسران میرے بارے میں یہ افترا پردازی کرتے پھر رہے ہیں کہ ایک سی بی آئی افسر کے ساتھ میری ایک شہوت انگیز سی ڈی موجود ہے۔ یہ سن کر میں دنگ رہ گئی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ مجھے خاموش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ کردار کشی کے ڈر سے میں گھبرا جاؤں گی۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے والد سے بات کی۔ شکر ہے کہ اب تک جو کچھ چل رہا تھا اس سے وہ بے خبر تھے۔ میرا بھائی عارف جو میرے لیے حمایت کا ایک ستون ہے اور میری والدہ جو میری قوت ارادی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ سب میرے

ساتھ آ گئے جب میں نے انھیں اس سلسلے میں بتایا تو میرے والد کو یہ احساس ہوا کہ میں گھبرائی ہوئی ہوں اور میری والدہ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے وہ بھی اتنی ہی پریشان خاطر اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔

میں نے ان سب کو فون کالس اور ان افواہوں کے بارے میں بتایا جو گردش کر رہی تھیں۔ اپنے والد کے الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ دیکھو بیٹا یہ سب ڈرامہ ہے۔ ان کو کہو کہ سی ڈی دکھائیں ہم سب دیکھیں گے۔

میری گھبراہٹ دور کرنے کے لیے وہ ہنس پڑے۔ میری ماں نے چین کی سانس لی اور میرے بال کو سہلانے لگیں۔ میری ماں نے کہا بیٹا جب ہم سب تم پر بھروسا کرتے ہیں اور تمہاری فیملی نے ایک سوال نہیں پوچھا تو تمہیں کسی اور کی فکر کیوں ہے۔

میرے بھائی نے بھی کم حمایت نہیں کی۔ انھوں نے ایک سینئر میڈیا پیشہ ور کی طرح، جو وہ ہیں، اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں ایک خط لکھو اور ان گھٹیا لوگوں کی جم کر خبر لو اور ان سے پوچھو کہ کیا ان کے پاس پیش کرنے کے لیے بس یہی تھا؟ لیکن مجھے زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑا میرے رفقائے کار اور صحافی برادری کے ساتھی میرے ساتھ چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ شوما چودھری جو اس وقت مینجنگ ڈائرکٹر تھیں انھوں نے اس ہفتے میرے خلاف جاری گھناؤنی تحریک کے جواب میں اداریہ لکھا جس میں انھوں نے یہ کہا:

> سینئر ایڈیٹر رعنا ایوب حالیہ ہفتوں میں مشکل دور سے گزر رہی ہیں۔ گزشتہ تین برس سے زیادہ عرصے میں رعنا نے، جو تہلکہ کی سب سے وقیع اور بیباک صحافی ہیں، گجرات کے فرضی انکاؤنٹروں کی کہانی کا ڈٹ کر تعاقب کیا ہے ان کی اس صحافت کا محرک عدل اور دستوری قدروں سے گہری وابستگی ہے، پھر بھی جب عشرت جہاں معاملے میں پیش کیے گئے ان کے دلائل قومی پیمانے پر سرخیوں میں آ گئے تو انھیں توہین آمیز تجربے سے گزرنا پڑا کیوں کہ ان کا جائزہ

ایک پیشہ ور کے طور پر نہیں بلکہ ایک مسلم صحافی کے طور پر لیا جارہا ہے۔ اتنا ہی نہیں حوصلہ شکن بات یہ بھی ہے کہ افترا پردازی پر مبنی ایک گھناؤنی تحریک ان کے خلاف چھیڑ دی گئی ہے۔ ایک سی ڈی کے بارے میں چہ میگوئیاں چل رہی ہیں کہ اس میں وہ اور سی بی آئی افسران ملوث ہیں جب کہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بھارت ایک ناقص تجربہ ہے لیکن اگر ہم اس شاعرانہ تخیل کو چھوڑ دیں جس پر اس کی بنیاد رکھی ہے تو پھر ہمیں یہی سننے کو ملے گا۔ ہندو وطن پرست، مسلم صحافی اور خاتون پیشہ ور جن کے پر کترنے کی کوشش ہم گھٹیا جھوٹ کے ذریعہ کرتے رہتے ہیں۔

پلانٹ شدہ سی ڈی والی کہانی اپنے آپ خاموش موت مر گئی۔

دوسری طرف امت شاہ کے بارے میں روزانہ انکشافات ہو رہے تھے کہ وہ ریاستی پولیس کے ساتھ مل کر معصوم شہریوں کے خلاف نگرانی کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایسی ہی ایک شہری کا نام مانسی سونی تھا جو ایک نوجوان آرکیٹکٹ تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ ان سب معاملوں میں مرکزی اور کلیدی رول ادا کرنے والوں میں جی ایل سنگھل تھا جو کبھی امت شاہ کا رازدار ہوا کرتا تھا۔ ایک بڑے اہم وقت میں ان گفتگوؤں کو ریکارڈ کیا گیا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جب عشرت جہاں معاملے میں تحقیقات کے لیے متعین ایس آئی ٹی نے ابتدائی تحقیقات کرنی شروع کر دی تھیں۔ زیر گفتگو افسر سنگھل جس نے پسماندہ طبقوں کے افسران کا استعمال کر کے ریاستی پالیسی کو انجام دینا شروع کیا تھا۔ وہ اپنا تحفظ چاہتا تھا۔ اور ایسا کرنے کے لیے اس سے بہتر طریقہ بھلا کیا ہو سکتا تھا کہ اسی طریقہ کار کا استعمال کیا جائے جو اس زمانے میں گجرات میں دھڑلے سے چل رہا تھا یعنی غلط طریقے سے فون کو ریکارڈ کرنا۔

احمد آباد کے کارکنان نے آر ٹی آئی کے ذریعے جو معلومات اکٹھا کی تھیں ان میں یہ بتایا گیا تھا کہ ۶۰ ہزار سے زیادہ نمبروں پر غیر قانونی طریقے سے نگرانی رکھی جا رہی تھی۔ فہرست

میں حزب مخالف کے ممبران، پارٹی کے وہ افراد جو اقتدار کے خلاف بغاوت کی کوشش کر رہے تھے، صحافی اور پولیس افسران شامل تھے۔

سنگھل اس طرح کے طریقہ کار اور ان گندے حیلوں کے لیے اجنبی نہیں تھا جن کا راز اس نے ہمیں بتایا تھا اور اس طرح سے وزیر کی فون کالس اور اس کی گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایسی ہی ایک اہم ٹیپ شدہ گفتگو کا تعلق اس آرڈر سے تھا جس میں شاہ نے سنگھل کو مانسی نامی گجرات کی ایک نوجوان آرکیٹکٹ کی نقل و حرکت پر لگاتار نظر رکھنے کے لیے کہا تھا جس کا تعارف تباہ کن گجرات زلزلے کے بعد بازآبادکاری کے دوران ایک آئی ایس افسر پردیپ شرما نے سنگھل سے کروایا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ مانسی اس وقت بنگلور میں رہ رہی ہے۔ نگرانی سے متعلق تمام حقائق میرے پاس ٹیپ میں موجود تھے۔ لیکن میں اس چیز سے باخبر تھی کہ ان ٹیپوں کو شائع کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ مانسی کی ذاتی زندگی اور بنگلور میں اس کا پُرسکون وجود اچانک ختم ہو جائے۔(۸)

وقت تیزی سے نکلا جا رہا تھا۔ میری ایڈیٹر شوما اپنے پرسنل اسسٹنٹ کے موبائل فون سے ایک پی سی او کے نمبر پر فون کرتی تھیں جو میں نے انھیں دے رکھا تھا اور وہ مجھ سے پوچھا کرتی تھیں کہ تمھیں کیا ملا اور وہاں کیا چل رہا ہے۔ میں ان کو واقعات کی پوری تفصیل بیان کرتی تو وہ خوشی سے اچھل پڑتی اور جوش میں آ کے کہنے لگتی: 'رعنا، یہ تو بہت زبردست ہے۔'

لیکن ابھی بھی بہت ساری ایسی خامیاں تھیں جن کو ٹھیک کرنا میرے لیے ضروری تھا۔ جس کے لیے مجھے کچھ بیوروکریسی سے جڑے لوگوں سے ملنا تھا۔ مثلاً ہوم سکریٹری، اہم مشیر کار جو مختلف قسم کی جرم میں ملوث کرنے والی دستاویزوں (incriminiating documents) پر دستخط کرنے کے ذمہ دار تھے اور جنھوں نے مودی اور شاہ سے بلاواسطہ احکامات لیے ہوں گے۔ ان میں سے اکثر ناناوتی کمیشن کے سامنے حاضر ہوئے تھے اور ان کی

پوچھ تاچھ ہوئی تھی لیکن وہاں ان پر نسیان طاری ہو گیا تھا اور انھیں کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ بلاواسطہ طور پر ملوث نہیں تھے، لیکن کسی بھی جرم کے بارے میں معلومات کو چھپا کر گجرات کے فساد متاثرین کے لیے عدل کے پورے عمل میں مخل ہو رہے تھے۔

میرے رفیق کار آشیش کے لیے یہ آسان تھا کہ مجھے ایسے مقامی غنڈوں سے وہ ملوادیں جو فخریہ طور پر گجرات فسادات کے دوران مسلم خواتین کو مارنے کے متعلق اپنی بہادری کا چرچا کریں لیکن یہ میرا مقصد نہیں تھا، مجھے ذمہ دار کلیدی لوگوں کی تلاش تھی جیسے کہ گجرات کے داخلہ سکریٹری، ڈائرکٹر جنرل آف پولیس، کمشنر اور فسادات کے دوران آئی بی کے سربراہ وغیرہ۔ ہر روز میرا سر چکراتا رہتا تھا۔

اتنے سارے ذہنی دباؤ کے ساتھ ایک اور مصیبت یہ آن پڑی کہ مانک بھائی نے ہم لوگوں سے کہا کہ ہمیں اپنے روم خالی کرنے ہوں گے کیوں کہ ان کی اپنی کانفرنس ہونے والی تھی اور آنے والے وفود کو ان تمام کمروں میں ٹھہرایا جانا تھا۔ ایک بار پھر میں بے گھر ہو گئی تھی۔



باب پنجم

دریں اثنا

اس سے پہلے کہ کہانی کے دیگر کرداروں کے بارے میں کچھ کہوں، گجرات کی ایک بہت مشہور خاتون پولیس افسر اوشارادا کا تعارف کرانا بہت اہم ہے۔ خفیہ طور پر اس کی تفتیش کرنا میرا مقصد نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں شک کا ایک عنصر پایا جاتا تھا۔ لٰہذا مجھے احساس ہوا کہ ایسا کرنے میں کوئی نقصان بھی نہیں ہے کیوں کہ رادا جو پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس سے مل کر میری کہانی کے بناوٹی چہرے کو مزید تقویت ہی ملے گی۔ رادا اَبھے چوڑاسما کی جونیئر تھی اور بڑی وفادار تھی۔ میرے گجرات سے نکلتے ہی اوشارادا نے اس اسپیشل ٹاسک فورس سے استعفیٰ دے دیا جس کو سپریم کورٹ نے ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۶ء کے درمیان گجرات میں وقوعہ ۱۶ پولیس انکاؤنٹروں کی تحقیقات کے لیے تشکیل دیا تھا۔

سہراب الدین شیخ فرضی انکاؤنٹر معاملے میں سی بی آئی کے ذریعے گرفتار چوڑاسما ۲۰۰۷ء اور ۲۰۱۰ء کے دوران رادا کا باس رہ چکا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب یہ دونوں کرائم برانچ میں متعین تھے، قیاس آرائیاں شباب پر تھیں کہ رادا تحقیقات کے پورے عمل کو چوڑاسما کے حق میں لانے کے لیے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرے گی۔

گجرات پولیس کنٹرول روم اب تک میری پسندیدہ جگہ بن چکا تھا۔ جب بھی مجھے کسی پولیس افسر کے نمبر کی ضرورت پڑتی میں اپنے بناوٹی لہجے میں ان کو فون کرتی اور اپنا تعارف ایک ایسے امریکی فلم ساز کے طور پر کرواتی جو گجرات کی بارسوخ خواتین پر ایک دستاویزی

فلم بنا رہی ہے، تو دوسری طرف لائن پر موجود متعلق پولیس افسر نہ صرف یہ کہ خوشی خوشی لینڈ لائن نمبر فراہم کراتا بلکہ مطلوبہ افسر کا موبائل نمبر بھی مہیا کروادیتا تھا۔ میں نے جب اُوشا رادا کو فون کیا تو وہ پوچھ تاچھ کے عمل میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک ایس ایم ایس بھیجا۔ دو گھنٹے بعد اس نے مجھے فون کیا اور احمد آباد کے سرکٹ ہاؤس پر ملنے کو کہا۔ ڈینم اسکرٹ، کالی ٹی شرٹ اور ڈھیروں بھڑکیلے زیور پہن کر میں میٹنگ کے لیے نکل پڑی۔ میں نے اپنے سر کے ارد گرد ایک رومال لپیٹ رکھا تھا۔ اپنے ساتھ ایک کیمرہ اور کندھے سے لٹکنے والا بیگ بھی لے لیا۔ استقبال کی ذمہ داری ادا کرنے والے شخص نے مجھے وہاں تک پہنچایا جہاں بیٹھنے کا نظم تھا۔

چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ رادا پہنچ گئی۔ یہ ایک لگ بھگ تیس سالہ خاتون تھی جو لڑکوں کی تراش کے بال کٹواتی تھی، طویل قامت اور چھریرے بدن کی تھی۔ اس نے کالی رنگ کی ٹی شرٹ اور جینس پہنی تھی، پاؤں میں اسپورٹس شوز تھے جن کی وجہ اس کی شخصیت کی جاذبیت اور بڑھ گئی تھی۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس نے مجھ سے معانقہ کیا۔ پُرتپاک انداز میں مصافحہ ہوا اور چہرے پر بڑی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس نے پوچھا: 'ہیلو میتھلی، آپ کیسی ہیں؟'

ہم آرام سے بیٹھ گئے، اس کی شخصیت کی میں نے جم کر تعریف کی۔ ساری باتیں جھوٹی بھی نہیں تھی۔ رادا یقیناً ایک دل چسپ شخصیت کی مالک تھی اور مسکرانے کا انداز تو ایسا تھا کہ میرے تمام خوف ہوا ہوگئے۔ ہماری گفتگو کے ایک گھنٹے میں ہی اس نے مجھ سے وعدہ کرلیا کہ وہ مجھے فلمیں دکھانے لے جائے گی، شاپنگ کروائے گی اور گجرات کے ایک سب سے مشہور تھالی جوائنٹ پر کھانا کھلائے گی۔

اپنی سرکاری جیپ میں مجھے نہرو فاؤنڈیشن تک چھوڑ کر گلے ملنے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ تم مجھے اپنی دوست سمجھو اور کسی مدد کی ضرورت ہو تو بے جھجھک بتاؤ۔

دوسری ہی صبح میرے فون پر اوشا کی جانب سے ایک میسیج پڑا تھا۔ میتھلی، ایس جی ہائی وے پر ساڑھے نو بجے رات کو تم مجھ سے ملنا۔ میں نے فوراً ہی اثبات میں جواب لکھ بھیجا لیکن جیسے ہی میں نے فون بند کیا مجھے اپنے رگ وپے میں خوف کی لہر سرایت کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ آخر رات کے ساڑھے نو بجے ایس جی ہائی وے پر وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہے گی؟

گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں ایس جی ہائی وے کے لیے میں نے ایک آٹو لیا۔ متعین شدہ جگہ پر پہنچ کر اس کو فون کیا۔ اوشا نے مجھے اپنا فون آٹو ڈرائیور کو دینے کو کہا تاکہ وہ اس کو بتائے کے کہ کس جگہ پر اس کو مجھے لے کر جانا ہے۔ ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے فون مجھے واپس کیا۔ اس کو شکایت تھی کہ مجھے اس کو پہلے ہی بتانا چاہیے تھا کہ آگے اتنا لمبا راستہ طے کرنا ہے۔ تب تک تقریباً دس بج چکے تھے۔ اوشا کی گزارش ماننے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اگر میں خوف زدہ تھی تب بھی میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ کئی کلومیٹر تک چلتے رہنے کے بعد اوشا کی پولیس والی گاڑی سڑک پر نظر آئی۔ گاڑی کے پاس صرف تین اور پولیس والے انتظار کر رہے تھے۔ میں آٹو ڈرائیور سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ مجھے واپس لے چلے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری جانب چلتے ہوئے اوشا نے مجھ سے کہا: 'ہیلو' اور اپنی جیپ میں مجھے بیٹھنے کو کہا، پھر کہنے لگی: 'چلو، میں تمھیں ایسی جگہ لے جا رہی ہوں جو تمھیں پسند آئے گی۔'

میں رونا چاہتی تھی۔ گجرات میں قیام کے دوران پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے تھے۔ جب میں جیپ میں بیٹھی تو اوشا بولتی رہی اور میں اپنی عادت کے خلاف گم سم بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ فون اُٹھاؤں اور اپنے اہل خانہ سے بات کروں، انھیں بتا دوں کہ وہ آخری آدمی کون تھا جس سے میں ملی تھی تاکہ اگر میرے ساتھ خدانخواستہ کوئی حادثہ ہو جائے تو ان کو معلوم تو رہے۔

لیکن اوشا کو سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ ہم احمد آباد کے سب سے شان دار

ریستوراں پر جاکر رکے۔ خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا: 'دیکھو، میں چاہتی تھی کہ تم بھی دیکھ لو کہ ہمارا احمد آباد تمہارے امریکہ سے کم نہیں ہے۔ میں مسکرائی۔ یہ سکون کی وہ مسکراہٹ تھی جس کو اوشا کبھی نہیں سمجھ پائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اجازت لے کر غسل خانہ پہنچی۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ میں کبھی اتنا روئی ہوں گی جتنا میں اس دن ٹوائلٹ میں روئی تھی۔ میں کھانس رہی تھی۔ میری آنکھوں اور ناک سے پانی کی جھڑی بہہ رہی تھی اور قے کرنے کے قریب ہو گئی تھی۔

ریستوراں چھوڑنے سے قبل ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے اس کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اس کی جو تعریف میں نے کی تھی وہ سچ تھی۔ ہم اس وعدہ پر جدا ہوئے کہ دوسرے دن اس کے گھر پر ہماری ملاقات ہوگی۔ ریستوراں میں ہماری گفتگو ان مسلمانوں سے ہٹ کر، جنھوں نے گجرات کو دہشت زدہ کر رکھا تھا، اس کے سینئر اَبھے چوڑاسما کی طرف مڑ گئی جو اس کے لیے کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔

دوسری شام مجھے اوشا سے اس کے گھر پر ملنا تھا۔ میں نے اپنا خصوصی کرتا چارج کرنے والے آلے سے اتارا۔ کیمرے کو دیکھا بھالا، کرتا پہنا اور نہرو فاؤنڈیشن سے نکل گئی۔ جب میں نیچے اتر رہی تھی تو میرا تعارف فاؤنڈیشن میں رہنے آئی ایک نئی لڑکی راجی سے ہوا جو ممبئی کی رہنے والی تھی اور اب میری پڑوسی ہونے والی تھی۔ پانی اور اس کے دوست ہاسٹل لوٹے ہی تھے، جرمنی کی رہنے والی ایک دوسری لڑکی ہمارے ساتھ ہاسٹل میں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہ اسکائپ پر اپنے اہل خانہ کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ جب میں اس کے کمرے کے پاس سے گزری تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی ماں کو ہیلو کہتی جاؤں۔

جب میں شاہی باغ کے قریب واقع پولیس کوارٹرس پہنچی تب تک اوشا اپنے روزمرہ کے کپڑے زیب تن کر چکی تھی اور کھانے کے لیے تھالی سجائی جا چکی تھی۔ اس کی بیٹی لیپ ٹاپ پر کام کر رہی تھی۔ اوشا نے میرا تعارف اس سے کرواتے ہوئے کہا کہ وہ مجھ سے مشورہ

لے لے کہ اپنی اسکولی تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکہ کے کن کالجوں میں درخواست دینا مناسب رہے گا۔ اوشا ایک مطلقہ ماں تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور اب اپنے بچوں اور والدین کے ساتھ رہ رہی تھی۔ میں نے اوشا سے کہا کہ آج تم سے تمہاری پولیس فورس کے بارے میں نوٹس لینے ہیں، اس نے کہا: ’آج نہیں۔ آج فلم دیکھنے جاتے ہیں۔‘ مجھے مایوسی تو ہوئی لیکن چہرے سے میں نے یہ اظہار نہیں ہونے دیا۔

چند منٹوں میں ہم احمد آباد کے ایک مشہور سنیما گھر پہنچ گئے۔ لیکن جوں ہی ہم سنیما گھر کے احاطے میں داخل ہوئے میرا دل ڈوب گیا کیوں کہ داخلی دروازے پر تلاشی زون تھا اور میٹل ڈٹیکٹر لگا تھا۔ میرے کرتے میں کیمرہ نصب تھا۔ مجھے لگا کہ اب تو کام سے گئے۔ خوف کے مارے میرا منہ سوکھا جارہا تھا۔ ہم قطار میں کھڑے تھے۔ اوشا طرح طرح کی باتیں کرتی رہی لیکن میری توجہ باڑ ہی پر لگی رہی۔ چند منٹوں میں ہی برقی آلہ کیمرے کا پتہ بتادے گا اور میں پکڑی جاؤں گی۔ لیکن معجزے رونما ہوتے ہیں اور اس دن بھی ہوا۔ ایک کانسٹیبل جو چیک پوائنٹ کے قریب کھڑا تھا اس کی نظر قطار میں کھڑی اوشا اور مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے ہمیں ایک دوسرے دروازے سے اندر داخل کروادیا۔ اگرچہ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور رات بھی بہت سرد تھی لیکن میں اپنی پشت پر پسینے کے قطرے رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار پھر میں بچ گئی تھی۔ پاپ کورن اور کوکا کولا لیے ہم نو وَن کلڈ جیسیکا دیکھنے کے لیے اندر چلے گئے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ فلم بھی جیسیکا لال قتل معاملہ پر تہلکہ کی تحقیقات پر مبنی تھی۔

جب اعترافات کی فہرست پردہ پر چلنے لگی اور فلم نے تہلکہ کے ذریعہ کیے گئے کام کا اعتراف کیا تو اُوشا نے چپکے سے مجھ سے کہا، تم نے تہلکہ کے بارے میں سنا ہے۔ یہ بدمعاشوں کی ایک ٹولی ہے۔ اپنے فون میں کیمرہ لگا کر یہ لوگ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں اور خفیہ طریقے سے لوگوں کی تفتیش کرتے ہیں۔ انھوں نے گجرات میں ہمارے لوگوں کی

بھی خفیہ تفتیش کی تھی۔ اپنے بھول پن کو مزید بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے پوچھا: 'یہ تہلکہ کیا ہے؟ کوئی ٹی وی چینل ہے؟' 'نہیں نہیں۔ یہ ایک ویب سائٹ ہے۔ کبھی مت دیکھنا اس کو۔ انڈیا کے بارے میں ساری غلط باتیں ہوتی ہیں۔' فلم دیکھتے ہوئے اوشا نے جواب دیا۔

اس رات جب میں لوٹ کر اپنے کمرے میں آئی تو اس سرکس کے بارے میں سوچ سوچ کر مسکراتی رہی جس کا میں حصہ تھی۔ حالات کی ستم ظریفی پر مجھے ہنسی آرہی تھی اور اس اندیشے پر بھی جو پہلے مجھے تھا کہ آیا میں اپنے سینئر رفقائے کار کی امیدوں پر کھری اترپاؤں گی یا نہیں؟

کیا حقیقت کو ڈھونڈھ نکالنے میں میں ناکام ہو جاؤں گی؟ میرے پاس دو دن بچے تھے جن میں مجھے ٹھہرنے کے لیے دوسری جگہ کی تلاش بھی کرنی تھی۔ پانی نے پیشکش بھی کی تھی کہ اس کے کمرے میں ٹھہر جاؤں لیکن میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ ہر رات مجھے اپنا کُرتا، اپنی ڈائری اور گھڑی چارج کرنا ہوتا تھا۔ ان ساری چیزوں میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ معمولی سی معمولی غلطی کا ارتکاب کر کے بھی میں صورت حال کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ میں نے پانی سے اس کا لیپ ٹاپ مانگا۔ میں اپنا ذاتی ای میل استعمال کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اپنے لیپ ٹاپ کے استعمال سے گریز کرنا لازمی تھا۔

اس رات جب رعنا ایوب کے نام سے میں نے لاگ ان کیا تو کم سے کم ہزار ای میل میرا انتظار کر رہے تھے۔ بہت سے ای میل دوستوں نے ارسال کیے تھے جنھیں میری گمشدگی پر فکر ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ ختم کر دیا تھا تاکہ انٹرنیٹ پر ایسا کچھ بھی نہ رہے جس سے رعنا ایوب کی تصویر کا سراغ ملے۔ میں نے فوراً ایک امریکی دوست کو ای میل لکھا جس کے اہل خانہ احمد آباد میں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں اس کے کسی دوست کے ساتھ شہر میں رہ سکتی ہوں؟ کیوں کہ ہوٹلوں میں رہ رہ کر میں تھک چکی ہوں۔

جس مستعدی کے ساتھ اس نے ای میل کا جواب دیا اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ اس کے اہل خانہ اور احباب راجکوٹ میں رہتے تھے لیکن اس کی فیملی کے ایک دوست کا بنگلہ ایس جی ہائی وے پر واقع تھا۔ گھر کے مالکان ملک میں نہیں تھے اور گھر کی دیکھ بھال ایک نگران کے ذریعے ہو رہی تھی جو کمپاؤنڈ میں ہی ایک عارضی گھر بنا کر رہ رہے تھے۔ انتظامات کے بارے میں بحث کرنے کے بعد میں نے اپنا سامان تیار کیا اور دوسری صبح مانک بھائی سے ملنے ان کے کیبن میں پہنچ گئی۔ مجھے پیسوں کی ادائیگی کرنی تھی۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ آپ دس دن کے بعد واپس آسکتی ہیں۔ تب تک وفد واپس ہو جائے گا اور کمرہ دوبارہ مہیا ہو جائے گا۔

بنگلے کی عمارت اگرچہ خوب صورت تھی اور بڑا سا باغ اور دالان بھی تھا لیکن ایک اکیلی عورت کے رہنے کی جگہ قطعی نہیں تھی۔ اس کے دائیں بائیں زیر تعمیر بنگلے اور عارضی جھگیاں تھیں جن میں مزدور رہا کرتے تھے۔ ان مزدوروں کو سورج غروب ہونے کے بعد قطعاً کوئی روشنی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ آمدورفت کے لیے کوئی سہولت نہیں تھی۔ گھر کا نگراں بازار جانے کے لیے سائیکل استعمال کرتا تھا جو بنگلے سے تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع تھا۔ عمارت کے احاطے میں ہی ٹوٹے تار، لکڑیاں، اینٹ اور سیمنٹ کے ڈھیر موجود تھے۔ بنگلے کے نگراں کالو بھائی کو میری آمد کی خبر دی جا چکی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ صدر دروازہ کھولتے دو آوارہ کتوں نے میرا استقبال کیا۔ کالو بھائی کی تین بیٹیاں تھیں اور یہ آوارہ کتے فیملی کا حصہ بن چکے تھے۔ یہی کتے بعد میں تنہائی کے ساتھی بنے۔

ایک دوسری حیرت انگیز چیز گھر میں میرا انتظار کر رہی تھی جس کے بارے میں کالو بھائی نے بتانا اتنا اہم نہیں سمجھا۔ ایک شام جب آٹو میں بیٹھ کر میں بنگلے پر لوٹی تو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دروازے پر دستک دینے کا کوئی مطلب نہیں تھا کیوں کہ کالو بھائی اپنے چھوٹے سے گھر میں دروازہ بند کر کے زوردار آواز میں ریڈیو سن رہے تھے۔ اس لیے میں نے فون کیا اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہارن بجائے تاکہ آواز سن کر اندر سے کوئی آجائے۔ میں اپنے ساتھ ایک

ٹارچ رکھا کرتی تھی تا کہ اندھیرے میں جہاں کسی قسم کی کوئی روشنی نہیں رہتی ہے راستہ ڈھونڈنے میں مددگار ثابت ہو۔

جیسے ہی میں نے دروازے کے اندر روشنی ڈالی کتے بھونکنے لگے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کتوں کی آواز پر کالو بھائی متوجہ ہوں گے۔ میرا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ کالو بھائی نے زور سے آواز لگائی: 'آرہاہوں میتھلی بین۔' اس دوران کتے لگاتار بھونکتے رہے۔

میں نے غسل کیا اور رات کا کھانا کھایا۔ تب تک کتے بھونکتے ہی رہے۔ میں نکل کر باہر آئی۔ گمان تھا کہ شاید بھوک کی وجہ سے کتے بھونک رہے ہیں۔ میں نے کالو بھائی کو پکار کر کہا کہ ان کو کھانے کو کچھ دے دیں۔ انھوں نے جواب دیا: 'ارے بین، ایک بار وہ سانپ بل میں چلا جاوے گانا، تو سب شانت ہو جائیں گے۔' 'سانپ؟' میں چیخ پڑی: 'کدھر؟'

اگلے پندرہ منٹوں تک کالو بھائی اور ان کی بیٹیاں مزے لے لے کر ناگ کے بارے میں بتاتے رہے جس نے پچھلے ایک سال سے بنگلے کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ جب وہ مجھے اپنے ساتھ اس کی تلاش میں لے گئے تو میں نے دیکھا کہ سانپ دیوار پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس دن کے بعد رات کو میں ٹھیک سے نہیں سو پائی۔ کتے ہر وقت بھونکتے رہتے۔ مجھے معلوم تھا کہ سانپ اپنی کمیں گاہ سے نکل چکا ہے۔ اکثر ہی یہ سوچ کر اُٹھ جاتی کہ کوئی دیوار پھلانگنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ ناقابل بیان معاملے میرے ساتھ ہونے لگا تھا۔ میری نبض کی رفتار اچانک تیز ہو جاتی اور ہر رات میں ٹھنڈے پسینے میں ڈوب جاتی۔ میرا حلق خشک ہونے لگتا اور دھیرے دھیرے کچھ بھی کھانا پینا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ اگر کسی افسر کو میری اصل شناخت کا پتہ چل گیا تو کیا ہو گا۔ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے یہ بنگلہ سب سے آسان جگہ تھی۔

بعد کے دنوں میں دوپہر کے وقت جب کوئی مشغولیت نہیں رہتی تھی تو کالو بھائی کی بیٹیاں اپنی کتابیں لے کر میرے پاس آتیں۔ میں چائے بناتی اور پارلے جی بسکٹ کے ساتھ

اس کا لطف لیتی۔ کتے مجھ سے بہت مانوس ہو چکے تھے اور مجھے بھی اب کتوں کے ساتھ سانپ کو کھیلتے دیکھ کر بہت مزہ آنے لگا تھا۔ کالو بھائی کی بیٹیاں اور میں نے مل کر سانپ کا نام مکھیا رکھ دیا تھا۔ لڑکیاں مکھیا پر کنکریاں پھینکتیں اور میں تھوڑے فاصلے سے اپنے فون کے کیمرے سے اس منظر کو قید کرتی رہتی۔



باب ششم

اشوک نارائن

مائیک ابھی تک دہلی سے لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے اہل خانہ اس سے ملنے کے لیے بھارت آئے ہوئے تھے۔ میں نے تاکیدی طور پر اس سے کہہ دیا تھا کہ گجرات میں جاری کام کے تعلق سے ذرا محتاط ہی رہے۔ یہ تقریباً اسی وقت کی بات ہے جب تہلکہ نے گجرات کے آئی پی ایس افسر سنجیو بھٹ کے بیان کو اپنے سرورق پر شائع کیا تھا۔ اس بیان کی اشاعت کا کام میرے رفیق کار آشیش کھیتان نے انجام دیا تھا جو شعبہ تحقیقات کے ایڈیٹر تھے۔ سنجیو بھٹ کے مطابق وہ اس مبینہ میٹنگ میں موجود تھا(۹) جو مودی اور متعلق پولیس افسران کے درمیان ہوئی تھی۔ اسی میٹنگ میں مودی نے ان افسران کو ۲۰۰۲ء کے فسادات کے دوران مسلمانوں کو مارڈالنے کی کھلی چھوٹ دی تھی۔ گجرات فسادات کا احاطہ کرنے والے اکثر صحافی، کارکن اور وکلا حیران تھے۔ بہت سے لوگ جنھیں میں جانتی تھی اور جن سے ذاتی طور پر میں نے بات کی انھوں نے اس کی دلیل کو قبول نہیں کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ کوئی بھی وزیر اعلی درجنوں اعلیٰ افسران اور نوکر شاہوں کے درمیان اس طرح کا حکم دے کر اپنی سیاسی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے سوالات تھے۔ جیسے کہ سنجیو بھٹ نے اتنے دنوں کے بعد بیان کیوں دیا؟ گجرات میں رپورٹنگ کرتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو چکا تھا لیکن سنجیو بھٹ نامی کسی شخص سے نہ تو میرا سابقہ پڑا اور نہ ہی اس کے ذریعے کوئی معلومات حاصل ہوئی۔ شوما نے مجھ سے فون پر پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کچھ افسران سے رابطہ کرکے سنجیو

بھٹ کے بارے میں کچھ بلوایا جائے؟ اس کے بارے میں سوال پوچھنے کے تئیں میں تھوڑا محتاط تھی کیوں کہ یہ اتنی خاص نوعیت کی بات تھی کہ اس سے شک پیدا ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے شوما سے کہا تھا کہ بہت سے تکنیکی اسباب کی بنا پر مجھے سنجیو بھٹ کے بیان پر اعتماد نہیں ہو پا رہا ہے۔ البتہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ واقعی اس کے بیان میں اگر ذرہ برابر بھی سچائی ہوئی تو میں ڈھونڈھ نکالوں گی۔

گجرات فسادات کے دوران جو اہم ترین فیصلہ ساز لوگ تھے میں ان سے ملنا چاہتی تھی۔ ایسے چار لوگ تھے جنھوں نے گجرات فسادات کے دوران کلیدی کردار نبھایا تھا۔ داخلہ سکریٹری اشوک نارائن، ڈائرکٹر جنرل آف پولیس چکرورتی، پولیس کمشنر پی سی پانڈے اور سورن کانت ورما جو ۲۰۰۲ء میں فسادات کے دوران وزیر اعلیٰ کا اہم مشیر تھا۔ اشوک نارائن سے ملنا جلنا میں شروع کر ہی چکی تھی۔

تہلکہ کی اس رپورٹ کے مطابق جس میں بھٹ کے بیان کا ذکر تھا اکثر وہ افسران جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ناناوتی کمیشن کے ذریعے جرح کے دوران نسیان کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔

۱۹۸۸ء کھیپ کے گجرات کیڈر کے آئی پی ایس افسر سنجیو بھٹ کے بیان کے مطابق وہ اس میٹنگ میں موجود تھا جس کو اس وقت کے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے منعقد کیا تھا اور اس نے اعلیٰ پولیس افسران سے کہا تھا کہ اقلیتی طبقے کے خلاف ہندوؤں کو اپنا غصہ نکالنے کا موقع دیا جائے۔

تاہم اکتوبر ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ نے سنجیو بھٹ کی اپیل کو رد کرتے ہوئے کہا تھا کہ سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے عدالت کو متاثر کرنے کی یہ ایک کوشش ہے۔ عدالت نے کہا تھا کہ:

> نو سال بعد جب اس نے اس طرح کے سنسنی خیز انکشافات کیے تو پھر اسی میلوں سے پردہ اُٹھانے میں اب تک اسے کون سی چیز مانع ہو رہی تھی؟ اس

معاملے میں خاموشی ایک ناقابل توضیح طرز عمل ہے۔ جسٹس ناناوتی کمیشن کے سامنے بھی اپنے بیان میں ای میل سے متعلق کچھ کہنے میں وہ ناکام رہا تھا۔ جب اس سلسلے کے ای میلوں کو ارسال کر کے اس نے کہا تھا کہ حریف سیاسی پارٹی نے پورے طور پر اس کی صلاحیت کا استعمال نہیں کیا تو آخر کمیشن کے سامنے ای میلوں کے بارے میں بیان دینے سے کون سی چیز اس کو روک رہی تھی؟ یہ بھی ایک ناقابل فہم بات ہے۔ اجمالی طور پر اپیل کنندہ کا طرز عمل مشکوک ہے۔

اگست ۲۰۱۵ء میں مودی حکومت کے دوران وزارت داخلہ نے انڈین پولیس سروس سے سنجیو بھٹ کی خدمات کو ختم کر دیا۔ اس کے رفقائے کار کا اعتراف ہے کہ سنجیو بھٹ ہمیشہ ایک متنازع شخص رہا ہے جس کے دعووں میں بہت تضاد ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اشوک نارائن سے ملنا زیادہ موزوں تھا تاکہ ۲۰۰۲ء کی دیگر پہیلیوں کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو سکے۔

اشوک نارائن سے جب میری ملاقات ہوئی ان دنوں وہ اپنی بیوی کے ساتھ گاندھی نگر میں واقع ایک قدیم بنگلے میں رہتا تھا۔ اس بار بھی اس تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ آخر میری مدد کے لیے گجرات پولیس کنٹرول روم تو موجود ہی تھا۔ ہماری میٹنگ دسمبر ۲۰۱۰ء کے آخری میں ہوئی۔ میں نے اس کے لینڈ لائن پر فون کر کے اپنی ڈوکیومنٹری کے بارے میں بتایا کہ اس کا مقصد گجرات کی اہم ترین شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ چوں کہ اس کے کارنامے بہت متاثر کن ہیں اس لیے میں اپنے رفیق کار کے ساتھ اس سے ملنا چاہوں گی۔

اشوک نارائن کے گھر جانے سے ایک رات پہلے مجھے معلوم ہوا کہ میرا لینس صاف کرنے والا سیال ختم ہو چکا ہے۔ جہاں رات کے آٹھ بجے بنیادی ضرورت کی اشیا کا مل پانا مشکل ہو وہاں اپنے لینس صاف کرنے والے سیال کو حاصل کرنے کی امید بھی کیسے کر سکتی تھی۔

میں نے لینس صاف کرنے کا متبادل حل آن لائن تلاش کرنا شروع کیا، تو ایک ویب سائٹ پر سلسلے وار بحث میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ لینس کو نمکین پانی میں ڈبونے سے اس کی صفائی ممکن ہے۔ لیکن اگلی صبح پارلے جی اور چائے ناشتے کے بعد جب نمکین پانی والے پیالے سے اپنا لینس نکال کر میں نے لگایا تو آنکھیں جلنے لگیں۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں نے صورت حال کو بد سے بدتر بنالیا ہے۔ کالو بھائی سے میں نے برف کے ٹکڑے منگوائے اور پھر جلتی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ ایک ٹیکسی کرایے پر لی اور ٹیکسی ڈرائیور کو نارائن کے گھر کا پتہ بتایا۔ راستے میں اَجے کا پیغام آیا کہ وہ گاندھی نگر میں موجود ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ نارائن کی بیوی نے اپنے گھر پر میرا استقبال کیا۔ وہ ایک پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ ان کے شدید اصرار پر مجھے پیش کردہ نمکین کو ختم کرنا پڑا جسے وہ ایک دو روز قبل ہی معروف و مشہور دکان سے خرید کر لائی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ۷۰ سالہ معمر شخص مسٹر نارائن تیار ہو رہے ہیں۔ چائے کی چسکیوں کے بیچ میری خانگی زندگی پر بحث چلی۔ کانپور میں آبائی گھر کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ ساتھ ہی میری شادی کے رشتے پر بھی ذکر چھڑ گیا۔ وہ ایک سیدھی سادی متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ خاتون تھیں جو گھریلو زندگی سے خوش تھیں جب کہ ان کی بیٹیاں بیرون ملک زندگی گزار رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی تصویریں مجھے دکھائیں اور اگلی ملاقات میں شادی کا البم بھی دکھانے کی پیشکش کی۔

اشوک نارائن گرم جوشی سے ہیلو کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھ سے معلوم کیا کہ ان کی بیوی نے ان کے غائبانہ میں ضیافت کا خاطر خواہ خیال رکھا کہ نہیں۔ اشوک جی ایک معمر شخص تھے، شاید میرے والد سے بھی زیادہ عمر دراز۔ ایک روحانی شخص جو 'جیو اور جینے دو' کے نظریے میں یقین رکھتے تھے، ادب اور دیومالائی امور کے بارے میں ان کی معلومات پر میں دَنگ رہ گئی۔ وہ ایک شاعر بھی تھے۔ اردو شاعری کو پسند کرتے تھے اور دو کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

میں ایک اردو مصنف کی بیٹی ہوں جنھیں ان کے کارناموں کے لیے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ میری پرورش میرے گھر پر منعقد ہونے والے مشاعروں اور محفلوں کے بیچ ہوئی تھی۔ اشوک نارائن کو اردو شعر میں جواب دینے کی تمنا تو شدید تھی لیکن ایسا کرنے سے میں نے خود کو باز رکھا۔ کیوں کہ میتھلی ایک قدامت پسند سنسکرت ٹیچر کی بیٹی تھی جس نے بیرون ملک اپنی زندگی گزاری تھی۔ مزید یہ کہ میتھلی مسلم طبقے سے کوئی خاص دل چسپی نہیں رکھتی تھی۔

لیکن نارائن نے کٹرپن کے ایسے کسی عنصر کا اظہار نہیں ہونے دیا جو گجرات فسادات میں مبینہ طور پر ملوث اہل کاروں کا طرہ تھا۔ مذہب کے معاملے میں وہ ایک آزاد خیال شخص تھے۔ اپنی گفتگو کے دوران میں نے ان سے یہ ذکر کیا کہ مجھے اکثر ذہنی اضطراب کے دورے پڑتے رہتے ہیں، لہٰذا اسی رات انھوں نے روحانیت کے موضوع پر ایک کتاب بذریعہ ای میل مجھے ارسال کر دی۔ ان میں مجھے ایک ایسا شخص نظر آیا جو دیگر افراد، تہذیبوں اور مذاہب کے تئیں احترام کا جذبہ رکھتا ہے۔ بنابریں میں پُرامید تھی کہ ان سے مجھے فرضی انکاؤنٹروں اور گجرات فسادات کے دوران رونما ہونے والے تمام واقعات سے متعلق معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ میری امید بر آئی کیوں کہ ایسا کرنے میں مجھے آخر کامیابی مل گئی۔ انھوں نے بتایا کہ گجرات کے داخلہ سکریٹری کے طور پر انھوں نے کسی بھی سیاسی ریلی کے لیے اجازت دینے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ جن ریلیوں سے منع کیا تھا ان میں پروین توگڑیا کے ذریعے منصوبہ بند ریلی بھی شامل تھی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ گجرات کے بہترین افسران میں سے ایک راہل شرما کی معطلی کے وہ خلاف تھے۔ فسادات کے فوراً بعد نریندر مودی کی زیر قیادت حکومت نے راہل شرما کو معطل کر دیا تھا۔

چار دنوں تک ان کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ زیادہ تر باتیں چائے کی چسکیوں کے درمیان ہوئیں۔ ایک موقع پر ان کی بیوی کے ہاتھ کا بنا کھانا بھی کھایا۔ لیکن جس دن میاں بیوی نے مجھے کھانے کی دعوت دی اس دن میں بہت پریشان تھی۔ میرے ساتھ وہ

اپنے بچوں جیسا سلوک کرنے لگے تھے۔ میرا دل تب رو پڑا جب مجھے ان کی گفتگو سے معلوم پڑا کہ نریندر مودی کی ریاستی انتظامیہ نے خاموشی سے گجرات فسادات کو کیسے کیسے بڑھاوا دیا تھا اور اشوک نارائن اس کے سامنے بے بس تھے۔ یہ میرا ذاتی طور پر اخذ کیا ہوا نتیجہ نہیں تھا۔ خود اشوک نارائن کتنی بار اس کا ذکر کر چکے تھے۔

جس دن نارائن کی فیملی کے ساتھ مجھے لنچ کرنا تھا اس دن میں نے ان سے گزارش کی کہ وہ مجھے چند گھنٹوں کا موقع دیں تاکہ میں اطمینان سے ان کی شخصیت کا خاکہ تیار کر سکوں۔ میں نے اپنا پسندیدہ سبز رنگ کا کرتا پہنا اور اپنی بازوؤں کے ارد گرد شال ڈال لیے۔ وہ گھڑی بھی پہن لی تھی جس سے جڑے کیمرے کے حرکت میں آنے سے مدھم مصنوعی روشنی پھوٹ پڑتی تھی، میری وہ ڈائری بھی ہم راہ تھی جس کے ساتھ کیمرہ سی دیا گیا تھا۔ کیوں کہ کوئی بھی آدمی ایسی ملاقاتوں کے موقعوں پر کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا نہیں چاہتا لہٰذا کئی طرح کے کیمرے ساتھ رکھنے کی ہدایت ہوتی تھی۔

جب میں پہنچی تو کھانا تیار تھا۔ اس دن میں نے ان سے ان کی اہم ترین ذمہ داریوں یعنی گجرات کے داخلہ سکریٹری کی ذمہ داری وغیرہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے لیے ماحول بھی سازگار تھا لہٰذا موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا جیسے کھانے کی میز پر چلنے والی معمولی گفتگو ہو۔ نارائن بے دھڑک بولنے لگے اور پھر بولتے ہی گئے۔

کھانے کے بعد چائے کے دور کے لیے جب ہم بیٹھے تو انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح سے نریندر مودی نے فسادات کا انتظام کیا تھا۔ میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: 'نارائن صاحب، آپ جانتے ہیں میں پچھلے ایک ہفتے سے گوگل پر آپ کے بارے میں مواد تلاش کر رہی ہوں اور آپ کے نام کے ذیل میں بہت سے لنک گجرات فسادات، مودی اور مختلف کمیشنوں کے تعلق سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کو پڑھ کر میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ آپ جیسے مثالی اور انسانیت پرست آدمی کے لیے ایک ایسے متنازع فیہ شخص

کے ساتھ کام کرنا کتنا مشکل رہا ہو گا جو گجرات فسادات کا ذمے دار ہے۔ میں صرف تصور ہی کر سکتی ہوں کہ آپ پر کیا گزری ہو گی۔'

اور اس طرح گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

سوال: آپ تو غصہ سے تمتما گئے ہوں گے جب وزیر اعلیٰ نے (فسادات کو قابو کرنے کے سلسلے میں) یہ کہا ہو گا کہ سست رفتاری سے کام لیں؟

جواب: وہ ایسا کبھی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کبھی کاغذ پر کچھ لکھتا تھا۔ اس کے اپنے لوگ ہوتے تھے جن کے ذریعے پہلے وی ایچ پی تک اور پھر ان سے ہوتے ہوئے غیر رسمی چینلوں کے ذریعے نچلی سطح کے پولیس انسپکٹروں تک حکم پہنچتا تھا۔

سوال: اور اس طرح آپ بے بس کر دیے جاتے تھے؟

جواب: بالکل، اور جب تک ہم کو علم ہوتا کہ یہ کیوں ہوا، تب تک چیزیں انجام پا چکی ہوتی تھیں۔

سوال: اس طرح سے تو انکوائری کمیشنوں کے لیے بھی کوئی ثبوت باقی رہنے کی گنجائش نہیں رہتی رہی ہو گی؟

جواب: کئی بار ایسا ہوا کہ وزرا سڑک پر آکر بھیڑ کو بھڑکاتے تھے۔ ایک بار میں اسی کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ہمارے پاس ایک فون آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک وزیر ایسی حرکت کر رہا ہے، لہٰذا وزیر اعلیٰ نے اس کو طلب کیا، کم از کم اس ایک موقع پر (مودی) نے (کسی وزیر) کو طلب کیا تھا۔

سوال: کیا وہ وزیر بی جے پی کا تھا؟

جواب: ہاں بالکل۔ یہ آدمی اس کا اپنا ہی وزیر تھا۔

سوال: ایک مایا کوڈنانی نامی عورت تھی۔ سنا ہے وہ حکومت کی بہت مخالف ہو گئی تھی؟

جواب: ہاں، وہ وہاں ہو سکتی تھی؟

سوال: یہ تو جنونی کیفیت رہی ہو گی؟

جواب: ایک ذاتی تجربہ بتاتا ہوں۔ میں ایک مسلم سول سروس افسر کو جانتا ہوں۔ وہ ایک انتظامی افسر ہے۔ اس نے مجھے فون کیا اور بولا: 'سر، میری جان بچایئے، میرے گھر کو چاروں طرف سے گھیرا جارہا ہے۔' میں نے پولیس کمشنر کو فون کیا۔ اس نے ریکارڈ کیا کہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ کسی طرح اس افسر کی جان بچ گئی تھی۔ دوسرے دن اسی افسر نے پھر فون کیا اور بولا: 'سر، کل تو کسی طرح میں بچ گیا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ آج نہیں بچ پاؤں گا۔'

میں نے دوبارہ کمشنر کو فون کیا اور ان سے کہا کہ اُسے بچایئے، پندرہ دنوں کے بعد یہی افسر میری کیبن میں آیا۔ اس نے اپنی کہانی بتائی۔ کہا کہ سر، کالونی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور مسلم مارے جارہے تھے۔ جب آپ نے فون کیا تب پولیس فورس آئی۔ ایک وزیر بھیڑ کی قیادت کر رہا تھا۔ پولیس افسر نے اس کو سلام کیا۔ وزیر نے پولیس افسر سے پوچھا کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا۔ وہیں پر ایک پولیس افسر نے مجھے پہچان لیا اور مجھے بچا لیا۔

سوال: لیکن یہ وزیر تو سلاخوں کے پیچھے ہے نا؟

جواب: سب کے سب جیل کے باہر ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی کو انھیں اندر کرنا ہو گا۔ البتہ جب تک کوئی ثبوت فراہم نہ کرے تم یہ کیسے کر سکتے ہو؟

سوال: کیا کسی میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہے؟

جواب: کسی میں بھی ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

سوال: وزرا کے خلاف اقدامات کون کرے گا؟

جواب: میں تم کو ایک بات بتادوں۔ میں داخلہ سکریٹری کے عہدے کے بعد ویجیلنس کمشنر تھا۔ تمھیں پتہ ہے کہ ہر ریاست میں ایک لوک آیکت ہوتا ہے جو وزرا پر نظر رکھتا ہے۔ ایک دن میں وہاں گیا۔ ایمان داری سے بتا رہا ہوں، کہ اے سی کمروں میں

مکھیاں نہیں ہوتیں ورنہ میں یہ جملہ استعمال کرتا کہ وہ مکھیاں مار رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: 'سر، کیا کریں۔ وزرا کے بارے میں کوئی شکایت ہی نہیں کرتا۔ جب لوگ رشوت اور گھوٹالے جیسے معاملوں میں وزرا کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرپاتے تو پھر فسادات میں ملوث وزرا کے خلاف جانے کی جرأت کون کرپائے گا۔ کس کی شامت آئی ہے۔'

جب تک لوگ آگے نہیں آئیں گے، کیسے ہو گا؟ اور یہ وزیر لوگ اتنے چالاک ہوتے ہیں کہ فون پر باتیں بھی بڑی چالاکی سے کرتے ہیں۔ وہ افسروں کو فون کریں گے اور کہہ دیں گے کہ 'اس علاقے کا ذرا دھیان رکھنا۔'

اب عام آدمی کے لیے اس جملے کا عام فہم مفہوم تو تکنیکی طور پر یہی ہو گا کہ دھیان رکھو کہ اس علاقہ میں فسادات نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ دھیان رکھنا کہ اس علاقے میں فسادات رونما ہوں۔

وہ کام خود سے نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ایجنٹوں کے ایجنٹوں کے ایجنٹوں کا ایک سلسلہ ہے جو اس طرح کے کام انجام دیتے ہیں۔

اچھا پھر تم دیکھتے ہو گے کہ بھیڑ کے خلاف ایف آئی آر درج کی جاتی ہے تو اب ایک بھیڑ کو تم کیسے گرفتار کرو گے۔

سوال: لیکن کیا ان کمیشنوں کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا جو فسادات کے معاملوں میں غور کرنے کے لیے قائم کی گئی تھیں۔

جواب: ایک ناناوتی کمیشن قائم کی گئی تھی لیکن ابھی تک اس سے کچھ بھی سامنے نہیں آیا ہے۔ ابھی تک کوئی رپورٹ پیش کرنے میں وہ ناکام رہی ہے۔

جب میں داخلہ سکریٹری تھا تو میں نے احکامات جاری کیے تھے کہ جب تک تحریری شکل میں کوئی حکم نہ ملے اس وقت تک کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔ لہٰذا جب بند کا اعلان کیا

گیا تو چیف سکریٹری سباراؤ نے مجھے بلایا اور کہا کہ وی ایچ پی کا ایک لیڈر پروین توگڑیا ریلی کرنا چاہتا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا کہ سر اس طرح کی اجازت نہیں ملنی چاہیے ورنہ حالات بے قابو ہو جائیں گے۔ وزیر اعلیٰ کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ اس نے پوچھا کہ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ ہمیں انھیں اجازت دینی ہو گی۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ اگر ایسی بات ہے تو آپ تحریری شکل میں احکامات دیں۔ وہ (مودی) مجھے بس گھور کر رہ گیا۔

نریندر مودی اور پروین توگڑیا دونوں ایک زمانے میں گجرات میں ہندوتوا کی ترقی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ نریندر مودی (عمر ۶۴ برس) اور ڈاکٹر پروین توگڑیا (عمر ۵۸ برس) دونوں ساتھ میں ریاست کی آر ایس ایس شاکھاؤں میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہانی بہت مشہور ہے کہ دونوں ایک ساتھ موٹر سائیکل اور اسکوٹر پر بیٹھ کر پورے گجرات میں گھوم گھوم کر سنگھ کے نظریات کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ موٹر سائیکل ہمیشہ توگڑیا چلاتا تھا اور نریندر مودی اس کے پیچھے بیٹھتا تھا۔ توگڑیا ایک کینسر سرجن ہے جو ۱۹۹۳ء میں وشو ہندو پریشد کا حصہ بنا۔ اور مودی، جو پہلے سے ہی ہمہ وقتی پرچارک تھا، بی جے پی نے اس کو ۱۹۸۴ء میں پارٹی میں شامل کیا تھا۔ جب کیشو بھائی پٹیل وزیر اعلیٰ تھے تب دونوں اس مرکزی کمیٹی میں شامل تھے جو حکومت کے اہم فیصلے لیتی ہے۔ شنکر سنگھ واگھیلا، جس نے توگڑیا کو بھی قید میں ڈالا تھا، جب اس نے کیشو بھائی کے خلاف بغاوت چھیڑی تھی اس وقت یہ مودی ہی تھا جو اس کی حمایت میں اترا تھا۔

۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۱ء تک جب مودی ریاست سے تقریباً جلاوطن کر دیا گیا تھا اور گجرات میں ایک ناقابل قبول شخصیت بن چکا تھا ان دنوں وہ اپنا زیادہ تر وقت وی ایچ پی کے دفتر میں گزارتا تھا۔ کیوں کہ بی جے پی کے دفتر میں اب اس کی پذیرائی نہیں ہوتی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق اڈوانی ہی نے توگڑیا کو سمجھایا تھا کہ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں مودی کو بطور وزیر اعلیٰ گجرات لے کر آئے (۱۰)۔ توگڑیا اس بدلاؤ کے لیے راضی ہو گیا اور بدلے میں اپنے

دست راست گوردھن زدافیا کو مودی کی کابینہ میں بطور ریاستی وزیر داخلہ شامل کروایا۔ آر ایس ایس نظریات کے رنگ میں رنگے ہوئے پولیس افسران کی تقرری میں توگڑیا کی بات بہت چلتی تھی۔ انھیں پولیس افسران میں سے بہت سے ایسے تھے جنھوں نے فروری، مارچ ۲۰۰۲ء میں گودھرا فسادات کے بعد والے مرحلے میں نہایت گھٹیا کردار ادا کیا تھا جب وی ایچ پی اور بجرنگ دل کے کارکنان ریاست میں دہشت کی لہر بن کر گھوم رہے تھے۔

حالیہ دنوں میں عوام کو یاد ہوگا کہ ۲۱ سالہ نوجوان ہاردک پٹیل جو پٹیل طبقے کا مسیحا بن کر ابھرا ہے اس نے پوری ریاست کو ریزرویشن کے معاملے پر معطل کر دیا تھا۔ اس نے بے نیام تلوار ہاتھ میں لے کر ایک رپورٹر کو مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہا تھا کہ کیا وہ جانتا ہے کہ کتنے ہاتھوں کو اس نے کاٹا ہے؟ مانا جارہا ہے کہ ہاردک انہی کیشو بھائی پٹیل اور توگڑیا کی پیداوار ہے جنھیں بعد کے دور میں مودی نے گجرات میں کنارہ کش کر دیا تھا(۱۱)۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ ہاردک صرف ایک مہرہ ہے جس کا استعمال گجرات کی موجودہ وزیر اعلیٰ اور مودی کی قریب ترین حامی اور بااقتدار شخصیت آنندی بین کو بے دخل کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ آنندی بین خود پٹیل طبقے سے تعلق رکھتی ہے لیکن اب وہ ٹھیک اسی طرح کے حالات سے جوجھ رہی ہے جن سے مودی کے گجرات میں داخلہ سے قبل کیشو بھائی جوجھ رہا تھا۔

۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات اور اس کے بعد کے مرحلے میں پروین توگڑیا ہندوؤں کو بھڑکاتا پھرتا تھا اور وی ایچ پی کے کارکنان ننگا ناچ ناچ رہے تھے۔ گجرات میں کی گئی اپنی ایک تقریر(۱۲) میں توگڑیا نے کہا تھا کہ:

> گودھرا اسٹیشن پر دہشت اس لیے پھیلائی گئی کیوں کہ یہ ملک گاندھی کی اتباع کرتا ہے۔ ہم نے ۲۸ فروری کو گاندھی کو بند کر کے رکھ دیا۔ (مسلمانو) اپنے آپ کو درست کر لو ورنہ ہم گاندھی کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے۔ جب تک ہم گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد پر عمل کرتے رہیں گے اور مسلمانوں کے سامنے

جھکتے رہیں گے تب تک دہشت گردی کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے بھائیوں ہمیں گاندھی کو چھوڑنا ہوگا۔ کیا تم رامائن سے واقف ہو؟ گودھرا حادثے کے لیے اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ ۷ بج کر ۴۵ منٹ پر فاسیا سگنل پر ایس ۶ کا جلا ہوا ڈبہ دراصل ہنومان جی کی دُم تھی جس میں آگ لگائی گئی تھی۔

اس کی اس تقریر پر سامعین تالیاں پیٹتے ہیں۔ جے شری رام کے نعرے لگاتے ہیں اور تب توگڑیا اس رات ہزاروں کی تعداد میں اکٹھی بھیڑ سے پوچھتا ہے:

ہنومان کی دُم کو کس نے جلایا تھا؟ راون نے، ہنومان جی سیر کرنے کے لیے گئے تھے۔ ہم سنتے ہیں کہ ہنومان جی چلتے چلتے گودھرا آچکے تھے (بھیڑ ہنستی ہے اور تالیاں پیٹتی ہے) ہنومان جی ہلول، کلول اور سردار پورے تک آئے اور کرناوتی (احمد آباد) میں ٹھہر گئے اور پھر واپس جانا نہیں چاہا۔

اشارہ بالکل صاف تھا۔ لفظ راون کا استعمال مسلمانوں کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ ایک واضح اعلان تھا کہ گجرات کے مسلمانوں کو دبوچ کر قتل کیا جائے۔ ایک طرف جہاں توگڑیا کڑی محنت کر رہا تھا وہیں دوسری طرف رفتہ رفتہ مودی کو اکثریت والی اس ہندو آبادی کا ہندو ہردے سمراٹ سمجھا جانے لگا تھا جسے لگاتار یہ بتایا جا رہا تھا کہ تمہیں نیست و نابود کرنے کے لیے مسلمان نکل پڑے ہیں۔ البتہ مودی کے وزیر اعلیٰ بننے کے چند دنوں بعد ہی توگڑیا اور مودی کی اس رفاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ دونوں کے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔ ٹائمس آف انڈیا میں شائع ایک رپورٹ نے قدرے اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے:

دسمبر ۲۰۰۲ء کے اسمبلی انتخابات میں توگڑیا نے سو سے زائد ریلیوں کو بی جے پی کی حمایت میں خطاب کیا۔ لگ بھگ دو ہفتوں تک مسلسل ہیلی کاپٹر میں گھومتا رہا۔ حالات میں بدلاؤ تب آیا جب مودی کو الیکشن میں جیت حاصل ہو گئی۔ مودی نے فوراً ہی زدافیا کو اپنے وزرا کی کونسل سے باہر کر دیا۔ یہ بات توگڑیا کے لیے واضح اشارہ تھی کہ سرکار میں اب اس کی مداخلت کی ضرورت نہیں رہی۔ توگڑیا اور سنگھ پریوار کی دیگر جماعتوں کے ساتھ صلاح و مشورے کا عمل رک گیا۔

اشوک نارائن سے ملنے اور گجرات فسادات کے بارے میں ان کی ٹیپ شدہ باتیں یکجا کرنے کے چند دنوں بعد ہی میں نے ان سے درخواست کی کہ میں ان کے دوست اور فساد کے دنوں کے ان کے ہم راز جناب چکرورتی سے ملنا چاہتی ہوں جو اس وقت گجرات میں ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر فائز تھے۔ مجھے چکرورتی کے رول کا پتہ تب چلا جب نارائن اور اس کی بیوی بار بار یہ ذکر کرتے تھے کہ کس طرح سے نارائن کے اکلوتے دوست چکرورتی نے اُن بُرے دنوں میں نارائن کی زندگی کو قدرے آسان بنائے رکھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اکثر پولیس افسران نے مودی جتھے کی خاطر اپنی اخلاقی ذمہ داری سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ چکرورتی کے ساتھ ہوئی ملاقاتوں اور اس کے ذریعے کیے گئے انکشافات کی روداد اگلے باب میں زیر بحث آئے گی البتہ یہ اہم ہوگا کہ میں اپنے قارئین کے سامنے اشوک نارائن سے ہوئی گفتگو کا بقیہ حصہ پیش کردوں۔ اس وقت تک میں چکرورتی سے ممبئی میں مل چکی تھی اور اس کے ساتھ میری پہلی ملاقات مکمل ہوگئی تھی۔ اس لیے دیگر افسران کے حوالے سے گجرات فسادات کے بارے میں بات کرنا آسان ہوگیا تھا اور شک کی گنجائش بھی کم تھی۔

سوال: کیا چکرورتی واقعی اتنا متنازع شخص ہے؟

جواب: دیکھو، چوں کہ وہ پولیس کا سربراہ تھا۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہوگا الزام اس کے اور داخلہ ڈپارٹمنٹ کے اوپر ہی آئے گا۔ انسانی حقوق ڈپارٹمنٹ نے بھی اس معاملے کو دستوری طرفداری قرار دیا تو ہم سب اس میں آگئے، سنجیو بھٹ آئی بی میں تھا اور چکرورتی اس زمانے میں ڈائرکٹر جنرل تھا۔

سوال: تو کیا آپ میٹنگ میں نہیں تھے؟

جواب: کون سی میٹنگ؟

سوال: ظاہر ہے وہی متنازع میٹنگ جس میں وزیر اعلیٰ نے افسران اور نوکرشاہوں سے کہا تھا کہ (فسادات پر قابو پانے کے معاملے میں) سست رفتاری سے کام لیں۔

میں نے تم کو بتایا نا۔ وہاں اس میٹنگ میں موجود تھا، میں نے تم کو بتایا نا۔

جواب: ہاں ہاں، میں وہاں اس میٹنگ میں موجود تھا، میں نے تم کو بتایا نا۔

جواب: تو ایس آئی ٹی نے آپ کو نہیں بلایا؟

جواب: ارے ہاں، انھوں نے مجھے بلا کر بہت سوالات کیے۔ اسی لیے تو چکرورتی نے کہا تھا کہ اس میٹنگ نے ہم سب کو پھنسا دیا۔ چکرورتی بھی اس میٹنگ میں تھا۔

سوال: چکرورتی نے کہا کہ جو لوگ وزیر اعلیٰ کے قریب تھے ان میں سے کچھ افسران مثلاً پی سی پانڈے وغیرہ کو بچا لیا گیا تھا؟

جواب: نہیں، لیکن پی سی بعد میں ایس آئی ٹی کی وجہ سے تنازع میں پڑ گیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بھی متنازع ہو گیا تھا۔

سوال: لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ کا قریبی ہے؟

جواب: ہاں وہ تو ہے، لیکن ایسا ہی ہوا ہے۔ اگر تم برسر اقتدار پارٹی کے کہنے پر چلنے کا فیصلہ کر لو تو پھر تمہیں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔

سوال: اور وہ پورے طور پر وزیر اعلیٰ کا آدمی ہے؟

جواب: ہاں، اور اگر وہ نہیں ہوتا تو چکرورتی کی طرح اس کو بھی نکال کے پھینک دیا جاتا۔ جیسے کہ انھوں نے مجھے ریٹائر کروا دیا، کیوں کہ انھیں میری جگہ کسی اور کو لانا تھا۔ وہ میرے ماتحت کو چیف سکریٹری بنانا چاہتے تھے۔

سوال: یہ لوگ کتنے شاطر تھے!

جواب: اور اس طرح سے میں ویجیلنس کمشنر بنا (ان کی بیوی نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ) صرف یہی نہیں، ان کے جیسے تین دیگر افسران بھی بدلے گئے تھے۔

سوال: جیسے کہ وہ سری کمار جس کے بارے میں آپ بتا رہے تھے؟

جواب: ہاں۔ تمہاری فلم کے لیے اس کے پاس بہت مسالہ ہو گا۔ زیادہ تر باتیں سنسنی خیز ہوں گی لیکن اس میں حقیقت کی آمیزش بھی ہو گی۔ سب سے مضحکہ خیز پہلو تو یہ

ہے کہ سری کمار فسادات کے دوران سائڈ پوسٹنگ پر تھا لیکن فسادات کے بعد اس سے کہا گیا کہ آکر شامل ہو جائے اور وہ بھی میری اور چکرورتی کی سفارش پر۔ اس کے پاس سی بی آئی کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ تھا۔

لیکن بعد میں اس نے حلفیہ بیانات میں اس دور کے واقعات کی تفصیلات کو بھی داخل کرنا شروع کر دیا جن کا وہ حصہ ہی نہیں تھا اور اس طرح سے کچھ وقت کے بعد اس کو بھی بدل دیا گیا۔ درحقیقت وزیر اعلیٰ اس کو معطل کرنا چاہتا تھا لیکن ہم نے اس سے کہا کہ ایسا نہ کرے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پریس کے لیے زیادہ کام کر رہا تھا۔ وہ پریس کو خفیہ طریقے سے چیزیں بھیجتا تھا۔

سوال: لیکن وزیر اعلیٰ پر اتنے نشانے کیوں سادھے گئے؟ کیا اس لیے کہ وہ بی جے پی کے ساتھ ہے؟

جواب: نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ فسادات کے دوران اس نے وی ایچ پی کی حمایت کی تھی، اس نے ہندو ووٹ حاصل کرنے کے لیے یہ سب کیا تھا جو اس کو ملا بھی، جو وہ کرنا چاہتا تھا وہی اس نے کیا اور وہی ہوا۔

سوال: لیکن اس نے تو لوگوں کو سست روی سے کام لینے کو کہا تھا؟

جواب: اس طرح کی بات وہ میٹنگ میں نہیں کرتا تھا۔ ایسی باتیں عموماً وہ اپنے لوگوں سے کہتا تھا۔ اپنی بات وہ وی ایچ پی تک پہنچاتا اور پھر وہاں سے اس کی بات ٹنڈن جیسے دیگر افسران تک پہنچتی تھی اور بطور افسر تم کو جیسا کہا جائے ویسا کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

سوال: چکرورتی نے ہاں میں ہاں نہیں ملائی؟

جواب: صرف ہم لوگ ایسے تھے جنھوں نے بس اپنا کام کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جب ہم فورس میں آئے تھے تو ہمارا مقصد لوگوں کی خدمت کرنا تھا، برسر اقتدار پارٹی کی

خدمت مقصود نہیں تھی۔

سوال: تو پھر اور لوگوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

جواب: کیوں کہ انھیں کھیل کھیلنا تھا۔ ان کا ایک مقصد تھا، جس کے لیے تم کو سمجھوتہ کرنا ہوتا ہے۔ چکرورتی جیسے لوگوں کو دیکھو۔ ان کی نہ تو ترقیاں ہوئیں نہ ہی انھیں بیرون ملک بھیجا گیا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے وہ کیا جو ان کا ضمیر کہتا تھا۔

سوال: اس متنازع میٹنگ کے بارے میں باہر کے لوگوں کو کیسے پتہ چلا؟

جواب: یہ وزیر ہرین پانڈیا وہاں پر موجود تھا۔ پریس کو سب سے پہلے اُسی نے بتایا تھا۔

سوال: اس میٹنگ میں کون لوگ تھے؟

جواب: سی ایس، اے سی ایس، داخلہ سکریٹری، ڈی جی پی اور دیگر افسران۔

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایک معمولی فہم رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ گجرات فسادات کے دوران ریاست کس حد تک ملوث تھی۔ اشوک نارائن جو کچھ مجھے بتا رہے تھے وہ باتیں ایسی تھیں جن سے ہم سب واقف تھے لیکن یہ بات پہلے کبھی کسی سرکاری آدمی نے نہیں کہی۔ ایسا آدمی جس پر گجرات فسادات کے دوران سب کی نظریں لگی تھیں۔ جو چیز سب سے زیادہ دل چسپ ہے وہ ہے سماجی اور سیاسی سیاق جس کے بارے میں سابق داخلہ سکریٹری بات کر رہے تھے جب انھوں نے گجرات فسادات کے بارے میں بتایا اور وضاحت کی کہ نریندر مودی کے لیے اس فساد کا کیا مطلب تھا۔ نارائن کے موضوعی اور حقیقت پسند ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کسی بھی موقع پر وہ حقائق کو افسانہ کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ جس طرح سے سری کمار نے اپنے حلفیہ بیانات کو میڈیا کے سامنے افشا کیا اس کے بارے میں بھی انھوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ وہ اس میٹنگ کے بارے میں بھی بات کرتے ہیں جو گجرات کے فسادات کے دوران گاندھی نگر میں ہوئی لیکن کسی موقع پر بھی یہ اشارہ نہیں دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف پل پڑنے کے

احکامات وزیر اعلیٰ نے جاری کیے تھے۔ اس کے برعکس وہ زیادہ باریکی سے استدلال کرتے ہیں کہ کیسے اس طرح کے احکامات ذاتی طور پر ان افسران کو دیے جاتے تھے جنھیں مودی کی اس منڈلی میں سرخروئی حاصل تھی۔

میں وہاں بیٹھی اس شریف اور سادہ انسان کو سنتی رہی کیوں کہ وہ مجھے ایسی باتیں بتا رہے تھے جو انھوں نے ناناوتی کمیشن کے ذریعے جرح کے دوران بھی نہیں بتائی تھیں۔

'بی جے پی کی شہ پر وی ایچ پی نے بند کا اعلان کیا اور اس طرح سے اس کی شروعات ہوئی۔'

سوال: آپ کے لیے اس معاملے کو سنبھالنا تو ایک بڑا مسئلہ رہا ہوگا؟

جواب: ہاں، کیوں کہ جب تک بی جے پی کی طرف سے اشارہ نہ ملے اس کو سنبھالنا بہت مشکل تھا۔

سوال: مودی کی ساکھ کیا ہے؟

جواب: اس کی تو پوجا ہوتی ہے۔ دقیانوس ہندو سمجھتے ہیں کہ جھنڈا وہی تھامے ہوا ہے۔

سوال: کیا اس کا رول جانب دارانہ نہیں تھا؟

جواب: گودھرا معاملے کے لیے وہ معافی مانگ سکتا تھا۔ فسادات کے لیے بھی اس کو معافی مانگنی چاہیے تھی۔

سوال: مجھے معلوم ہوا ہے کہ مودی نے جانب دارانہ کردار تو لازماً نبھایا تھا مثلاً لوگوں کو بھڑکانا، گودھرا سے لاشوں کو لانا اور فیصلہ لینے میں ٹال مٹول کرنا وغیرہ؟

جواب: میں نے اپنے ایک بیان میں کہا بھی تھا جس میں میں نے بتایا تھا کہ لاشوں کو احمد آباد لانے کا فیصلہ مودی کا ہی تھا۔

سوال: تب تو ریاست آپ کے خلاف ہو گئی ہو گی؟

جواب: دیکھو لاشوں کو احمد آباد لانے کی وجہ سے سارا معاملہ اُبل پڑا۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں اشوک نارائن سے ملنے کے لیے اچانک ایک آدمی آگیا۔ اس کا نام کیلاش ناتھن تھا۔ مودی کا قریب ترین آدمی اور دوران فساد اس کا اہم صلاح کار۔ کیلاش ناتھن اس لیے ملنے آیا تھا کیوں کہ اشوک نارائن نے وزیر اعلیٰ کے دفتر میں ایک پیغام بھجوایا تھا کہ اس کا برادر نسبتی ہماچل پردیش سے جلد ہی ہونے والے اسمبلی انتخابات میں قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ مودی چوں کہ گجرات بھیجے جانے سے قبل ہماچل پردیش کا سابق انچارج رہ چکا تھا، لہٰذا اس ریاست میں اب بھی اس کو خاصا اثر ورسوخ حاصل ہے۔

یہاں یہ بات بہت پریشان کن تھی۔ تو کیا یہی وجہ تھی کہ افسران نے نریندر مودی کے خلاف کھل کر آنے سے انکار کر دیا تھا؟ اس بات نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔

کیلاش ناتھن جب چلا گیا تو اشوک نارائن کی بیوی نے اس کے بارے میں بتایا کہ وہ کتنا اہم آدمی ہے۔ ساتھ ہی مشورہ بھی دیا کہ اگر فلم بنانے میں کوئی دقت پیش آئے تو مجھے اس کی مدد لینی چاہیے۔

پرنسپل ایڈوائزر کے جانے کے بعد نارائن کے ساتھ گفتگو پھر سے شروع ہوئی۔

سوال: آپ کی ملازمت کا سب سے زیادہ چیلنج بھرا حصہ کیا رہا ہے؟

جواب: مجھے ہمیشہ یہ بات بُری لگی کہ فسادات کے دوران اتنے سارے لوگ مارے گئے۔ مثال کے طور پر بہت سے صحافیوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم نے استعفیٰ کیوں نہیں دیا؟ میں نے ان کو جواب دیا کہ اگر مجھے جرم کا احساس ہو گا تو میں استعفیٰ دوں گا۔

سوال: لیکن وہ غلط بھی نہیں تھے۔ آخر سیاسی اعتبار سے ایک مشکل صورت حال سے آپ دوچار تو تھے ہی؟

جواب: کسی بھی ریاستی سرکار کو اس طرح کے فسادات سے جوجھنا نہیں پڑتا ہے۔ فسادات کو (قابو میں) کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف چار کمپنیاں تھیں۔ یہاں تک کہ سی

آر پی ایف بھی اس کی اہلیت نہیں رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر ایک بھی ٹیم ہمارے پاس ہوتی تو ہمیں خوشی ہوتی۔ مرکز میں سرکار بھی بی جے پی کی ہی تھی۔

سوال: اس کا مطلب وزیر اعلیٰ آسانی سے مزید عملہ کی مانگ کر سکتا تھا؟ کیا یہ مرکز اور ریاست کے درمیان آپسی تال میل جیسا کوئی معاملہ تھا؟

جواب: بالکل، تال میل تو تھی ہی۔ ہمارا وزیر اعلیٰ اڈوانی سے جس وقت چاہتا بات کر سکتا تھا۔

سوال: مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ دونوں اچھے دوست بھی ہیں؟

جواب: بہت اچھے دوست ہیں۔ ہاں، ایک پہلو یہ بھی تھا۔

سوال: آپ نے وزیر اعلیٰ کو بتایا نہیں تھا کہ کوئی فورس نہیں ہے؟

جواب: اس کو سب پتہ تھا۔ تم کو کیا لگتا ہے کہ وہ بے خبر تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندو فرقہ کے چال چلن نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ بڑی بے شرمی سے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ کاروں میں بیٹھ کر آتے تھے اور لوٹتے تھے، بدترین انسان تھے وہ۔

سوال: کیا چیز ان کو ورغلا رہی تھی؟

جواب: گودھرا معاملہ

سوال: بڑی ہیجانی کیفیت رہی ہو گی؟ آپ کو اس طرح کے لوگوں کو رپورٹ کرنی پڑتی تھی؟

جواب: ان میں کبھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے کچھ غلط کرنے کو کہہ دیں۔

سوال: کیا سرکار کے غصے کی تاب آپ کو سہنی پڑی؟

جواب: ہاں بالکل۔ میں نے کہا کہ جیسے بھی احکامات ہوں مجھے تحریری شکل میں چاہئیں۔ دیکھو نچلی سطح کے افسر کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ ان سیاسی لیڈروں کو گرفتار کریں جو اس قسم کے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگوں نے سیاسی دباؤ میں آکر سمجھوتہ کر لیا۔

سوال: فسادات کے دوران ایسا ہی کچھ ہوا؟

جواب: ہاں۔ موبائل فون کے اس دور میں تم کو کاغذات پر احکامات دینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بس فون کرنا ہوتا ہے۔

سوال: وزیر اعلیٰ تو آپ سے نفرت کرتے رہے ہوں گے؟

جواب: اس کا تو پتہ نہیں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا کہ نہیں لیکن اس کی یہ خواہش تو ضرور ہی ہوگی کہ میری جگہ کاش کوئی دوسرا شخص ہوتا۔

سوال: وہ لوگ سب کے سب کیسے ملتے تھے؟ فسادات ہوئے کیسے؟

جواب: سب کچھ وی ایچ پی کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ وہ بڑا ہی دلخراش منظر تھا۔ گودھرا معاملہ یا فسادات دونوں میں سے کسی کو جائز ٹھہرایا نہیں جا سکتا۔

سوال: ٹرین جلنے کے رد عمل کے طور پر فسادات رونما ہوئے تھے؟

جواب: ان میں سے کسی واقعہ کو بھی تم جائز نہیں ٹھہرا سکتے۔

سوال: وزیر اعلیٰ کو استعفیٰ دے دینا چاہیے تھا۔ آخر وہ وزیر اعلیٰ تھا۔ خاص کر اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد۔

جواب: ایک مرحلہ ایسا آیا تھا جس میں اس کو بدلا جانا تھا۔ گوا میٹنگ میں، بظاہر اس نے استعفیٰ دیا بھی تھا لیکن اڈوانی کے دباؤ میں۔ پھر اڈوانی ہی نے واجپئی پر دباؤ ڈالا کہ استعفیٰ قبول نہ کرے۔ میں نے فسادات کے بارے میں اس وقت کے وزیر اعظم واجپئی کے سامنے اپنی بات رکھی تھی۔ مودی بھی وہاں موجود تھا۔

سوال: وزیر اعلیٰ تو آپ کی بات سے زیادہ خوش نہیں ہوئے ہوں گے؟

جواب: خوش یا ناخوش ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ مجھے اپنی پیشکش کے ذریعے بتانا تھا کہ اصل میں کیا ہوا۔ اس وقت بھی مجھے صاف نظر آیا تھا کہ واجپئی مودی اور اس کے طرزِ عمل سے خوش نہیں تھے۔

سوال: انھوں نے بھی یقیناً سست روی کا ثبوت دیا؟ وہ مستعدی دکھا سکتے تھے، لیکن انھوں نے بھی تو سیاست سے ہی کام لیا؟

جواب: اگر وہ استعفیٰ دے دیتا تو سیاسی اعتبار سے اس کو فائدہ ہی ہوتا۔ اب وہ اس شبیہ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔

سوال: مذہب کی بنیاد پر اس نے اقتدار حاصل کیا؟ اس کی زبان آوری۔۔۔

جواب: ۲۰۰۲ء میں ووٹ اس کو فسادات کی وجہ سے ملے۔ ۲۰۰۷ء میں اس کو اور ووٹ ملے کیوں کہ اس نے اپنی شبیہ ترقی والی بنالی۔

سوال: باقی لوگ کیسے تھے؟ میرا مطلب ہے افسران؟

جواب: سابق سکریٹری کے طور پر اگر کھل کے بولوں تو میں یہ کہوں گا کہ ڈی جی پی بذات خود ایک ایمان دار آدمی تھا۔ لیکن وہ اتنا نرم خو تھا کہ ایک مؤثر پولیس افسر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ فسادات کے دوران وہ سیاسی فرمانوں کے سامنے تو نہیں جھکا لیکن وہ اپنے لوگوں یعنی پولیس افسران پر لگام نہیں لگا سکا۔ ورنہ وہ راست باز تھا۔ مان لو کہ اگر افسرن کو تبدیل کرنے کے لیے سرکار اس پر دباؤ ڈالتی تو وہ کہہ دیتا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا مجھے کاغذ پر لکھ کر حکم دو۔

سوال: پھر تو سرکار کی نظر میں معتوب رہا ہو گا؟

جواب: ہاں۔ معتوب تو تھا ہی۔ میرے لیے ایک اچھی بات یہ تھی کہ فسادات کے دوران وہ میرے ساتھ تھا۔ کم سے کم ایک غیر جانب دار شخص تھا جس سے بہت تقویت ملتی تھی۔

تکنیکی طور پر دیکھا جائے تو تمام کابینی وزرا کے پاس سارا اقتدار ہوتا ہے لیکن کلکٹروں اور ڈی ایم کی طرح مخصوص قوت نہیں ہوتی ہے۔ دوسرے، اگرچہ اقتدار کے تمام معاملے میں نیابت کا نظام ہے لیکن اگر کابینی وزرا تمہیں غلط احکامات دیں تو

دستور ہند تم کو 'نہیں' کہنے کی اجازت دیتا ہے۔

سوال: کیا ان (فسادات) کے دوران آپ میں 'نہیں' کہنے کی جرأت تھی؟

جواب: ہمیں جو کہنا تھا ہم کہتے تھے، سب کچھ کہنے اور کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں ہمت بھی نہیں تھی کہ اس طرح کے احکامات جاری کریں، کیوں کہ وہ کاغذ پر لکھ کر نہیں دیتے تھے۔ لہٰذا میں کہتا تھا کہ میں صرف انہی احکامات پر عمل کروں گا جو تحریری شکل میں مجھے ملیں گے۔

جواب: آپ کو تو ریاستی حکومت کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا ہو گا؟

جواب: مجھے کرنا پڑا تھا، چیف سکریٹری کا عہدہ مجھے نہیں دیا گیا۔ انسپکٹر اور داروغہ جیسے افسران تک کے پاس کسی بھی وزیر یہاں تک کہ وزیر اعلیٰ کو گرفتار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن وہ لوگ سرکار کا ساتھ دینا پسند کرتے ہیں۔

سوال: کیا ایسا ہی کچھ ہوا تھا؟

جواب: ہاں، اور موبائل کے اس دور میں ان کو بس کہنا ہوتا ہے کہ کام کر دو، ویسے افسروں کو تو ترقی کی زیادہ پڑی رہتی ہے۔

جب فوج آئی تو انھیں بہت سے لوازمات کی ضرورت تھی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ فسادات کے لیے مناسب فورس ہمیں ملی ہی نہیں۔ ساری فورس ایودھیا میں موجود تھی۔ مرکزی سرکار وہ ہمیں نہیں دے سکتی تھی۔

سوال: فسادات پر سیاست کا رنگ کتنا چڑھا ہوا تھا؟

جواب: فرقہ واریت کے جذبہ سے وہ بھرپور تھے، برسرِ اقتدار پارٹی نے وی ایچ پی کے ذریعے کیے گئے بند کے اعلان کی حمایت کی تھی۔ یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا، سینئر پولیس افسران ہمیں کہتے تھے کہ بی جے پی کی طرف سے جب تک سیاسی اشارہ نہیں ملے گا کچھ اثر انداز نہیں ہو گا۔ کیوں کہ وہ سوچتے ہیں کہ ہم لوگوں کا ساتھ دے

رہے ہیں۔

سوال: لیکن مودی (مودی کی جیت) تو کسی اور چیز کے مقابلے ذاتی تعلق کا معاملہ زیادہ لگ رہا ہے؟

جواب: بالکل

سوال: دیکھیے، 'درخشاں گجرات' کے نعرے کو لے کر کتنا شور مچا رہے ہیں؟

جواب: (اثبات میں سر ہلا کر انھوں نے جواب دیا)

سوال: لیکن اس کے اوپر اتنا نشانہ کیوں سادھا جا رہا ہے؟

جواب: اس پر اس لیے نشانہ سادھا جا رہا ہے کیوں کہ اس نے وی ایچ پی کی حمایت کے پہلو کو اختیار کیا۔ اس نے بالکل وہی کیا جو اس کو کرنا تھا اور اس کو ملا بھی وہی جو وہ چاہتا تھا۔ چکرورتی جیسے لوگوں کی نہ تعریف ہوئی اور نہ ہی انھیں انعامات سے نوازا گیا کیوں کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز سنی۔

سوال: واقعتاً ہر شخص چیف سکریٹری جی سباراؤ کی تعریف کر رہا ہے؟

جواب: واقعی؟

سوال: میں طنز کر رہی ہوں۔

جواب: بدقسمتی سے سباراؤ سرکار کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ وزیر اعلیٰ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس میں بھی اس کو کامیابی نہیں ملی (مسکراتے ہوئے)۔

سوال: کیوں؟

جواب: میرا مطلب ہے کہ سرکار نے ریٹائرمنٹ کے بعد پانچ سالہ آرام دہ نوکری تو دی نا۔

سوال: مجھے اپنی فلم میں فسادات کے بارے میں کتنا ذکر کرنا چاہیے؟

جواب: دیکھو، اگر ایسا کروگی تو تمھاری فلم متنازع بن جائے گی کیوں کہ خود فسادات کی

نوعیت متنازع ہے۔

سوال: اسی لیے تو میں نے آپ کے وزیر اعلیٰ سے فسادات کے بارے میں ایک سوال بھی نہیں پوچھا؟

جواب: اگر تم پوچھتی تو وہ بات کسی اور طرف موڑ دیتا اور دوسری ملاقات کے لیے وقت بالکل نہیں دیتا۔

سوال: بھٹ جیسا آدمی وزیر اعلیٰ اور سرکار کے خلاف کیوں چلا گیا؟

جواب: کچھ تو وجہ رہی ہوگی۔ جو بھی اس کا باس رہا ہوگا اس نے اُسے سب بتایا ہوگا۔ جس کی ماتحتی میں وہ رہا ہوگا اُسی کے کہنے پر یہ سب ہوا ہوگا۔

سوال: کتنا قابل اعتبار ہے وہ؟

جواب: وہ قابل اعتبار بالکل نہیں ہے۔

سوال: اچھا، ویسے جینتی روی کا حوالہ مجھے مایا کوڈنانی سے ملا تھا۔

جواب: اوہ، اچھا۔

سوال: وہ تو بڑی سرکار مخالف لگ رہی تھی؟

جواب: اب سرکار مخالف ہوگئی ہے۔ لیکن پہلے نہیں تھی۔ پہلے تو وہ وزیر اعلیٰ اور سرکار کے ساتھ تھی۔

سوال: وہ اس بات سے پریشان تھی کہ کوئی اس کے بچاؤ کے لیے نہیں آیا؟

جواب: سیاسی باس کبھی کسی کے بچاؤ کے لیے نہیں آتا ہے۔

سوال: وہ تو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ پوری طرح بے قصور ہے؟

جواب: فسادات کے دوران تو یقینی طور پر وہ آر ایس ایس، وزیر اعلیٰ اور وی ایچ پی کی حامی تھی۔

سوال: اس کا مطلب ہے کہ فسادات کے دوران بڑھ چڑھ کر اس نے حصہ لیا تھا۔

جواب: ہاں۔

سوال: راہل شرما کیسا آدمی ہے؟

جواب: وہ باغیوں میں سے ایک ہے۔

سوال: کیا مطلب؟

جواب: مطلب یہ کہ اس نے کسی کی مدد نہیں کی۔ وہ بس فسادات پر قابو پانا چاہتا تھا۔

سوال: کیا وہ بھی نکال پھینکا گیا؟

جواب: اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ ڈی جی پی اور چکرورتی کی سفارشوں اور میری طرف سے ان کی سفارش کی تائید کے باوجود یہ تبادلہ ہو گیا۔

سوال: کیا صرف اس لیے کہ وہ وزیر اعلیٰ کے خلاف گیا تھا؟

جواب: یقیناً۔

یہاں پر ٹھہر کر راہل ورما کی کہانی بیان کرنے کی ضرورت ہے جس سے میری ملاقات دو یا تین سماجی موقعوں پر ہوئی تھی۔ پہلی بار میں اس سے تب ملی تھی جب وہ اپنی نہایت تعلیم یافتہ اور باوقار بیوی کے ساتھ اپنے ایک وکیل دوست سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ شرما مجھے خاموش مزاج شخص لگے جنھیں صحافیوں کے سامنے اپنی بہادری کی شیخیاں بگھارنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ اپنے کام کو خود ہی بولنے دینے اور اپنے قانونی معاملے پر خاموشی اختیار کرنے کے قائل تھے۔ جب تک میں وہاں رہی تب تک ایسا ہی تھا۔ اس زمانے میں ریاستی حکومت ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ ان کو بدل کر دوسرا افسر لایا گیا تھا۔ ان کی سالانہ خفیہ رپورٹ میں منفی تبصرے لکھے گئے اور ان کے خلاف دو چارج شیٹ بھی ڈپارٹمنٹ کی جانب سے داخل کی گئیں۔ آخر کار گجرات حکومت نے ۲۰۱۵ء میں ان کے قبل از وقت سبکدوشی کی درخواست کو منظوری دے دی۔

فروری ۲۰۱۵ء میں انڈین ایکسپریس میں شائع ایک رپورٹ نے ان کے بارے

میں یہ کہا تھا کہ:

شرما ان افسروں میں شمار کیے جاتے تھے جنھوں نے ۲۰۰۲ء میں گودھرا فسادات کے معاملوں میں ریاستی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا تھا اور ۲۰۰۲ء میں تحقیقات کے سلسلے میں تعاون کرتے ہوئے نرودا پٹیا، نرودا گام اور گلبرگ سوسائٹی قتل عام کے معاملوں کی تفتیش کار کے طور پر اہم ثبوت اکٹھا کیے تھے۔ آج کل سنٹرل ایڈمنسٹریٹیو ٹریبیونل میں تین مسئلوں کو لے کر وہ اپنی قانونی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے تین مہینے سے سبکدوشی کے لیے درخواست بھی دے رکھی تھی اور ۲۸ فروری ۲۰۱۵ء کو فیصلہ کن دن کے طور پر انتخاب کیا تھا البتہ ریاستی حکومت نے ان کے خط کو ان کے ذریعے منتخب کی گئی تاریخ سے صرف دو دن قبل قبول کر لیا۔(۱۳)

البتہ راہل شرما کے خلاف ریاستی حکومت کے غم وغصہ کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ سپریم کورٹ کے ذریعے تشکیل شدہ ایس آئی ٹی کا ان کے ساتھ ہوئی بدسلوکی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ۲۰۰۲ء فسادات پر ایس آئی ٹی کی رپورٹ میں ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ راہل شرما نے اس بات کو ثابت کیا تھا کہ نریندر مودی سرکار نے ان افسران کے ساتھ بدسلوکی کی تھی جو ۲۰۰۲ء میں تشدد کو ختم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ان کے ساتھ بدسلوکی اور ان کے تعاقب کا سلسلہ فسادات کے بعد بھی ریاست کے ہاتھوں جاری رہا۔

گجرات حکومت نے اعلیٰ آئی پی ایس افسر راہل شرما کے نام نوٹس جاری کر کے ان سے پوچھا تھا کہ فسادات کے دوران کام کرنے والے اعلیٰ سیاسی لیڈروں اور نوکر شاہوں کے فون ریکارڈ بغیر منظوری لیے انھوں نے انکوائری کمیشنوں کے حوالے کیوں اور کیسے کر دیے؟ فسادات کے نو سال بعد اس نوٹس میں شرما سے پوچھا گیا تھا کہ آخر ان کے خلاف کارروائی کیوں نہ کی جائے۔

یہ معاملہ ایسے وقت میں سامنے آیا جب ایس آئی ٹی نے خود بیان کیا تھا کہ فسادات کے

دوران منعقد ہونے والی اہم میٹنگوں کی کوئی تفصیل یا ریکارڈ مودی حکومت نے محفوظ نہیں رکھا تھا۔

۱۹۹۲ء کی کھیپ کے آئی پی ایس افسر شرما اپریل ۲۰۰۲ء میں احمد آباد میں (کنٹرول روم کے) ڈی سی پی تھے۔ گلبرگ سوسائٹی اور نرودا پٹیا میں ہونے والے تشدد کی تحقیقات کرتے ہوئے اے ٹی اینڈ ٹی (AT&T) اور سیل فورس (Cell Force) جیسی خدمات مہیا کرانے والی کمپنیوں سے اس دوران احمد آباد میں آنے والے اور باہر جانے والے تمام فون کال کے ریکارڈ یکجا کر کے انھوں نے کرائم برانچ کے حوالے کیے تھے۔ یہ CDs، جن میں اونچے درجے کے وزرا، پولیس افسران، آر ایس ایس اور وی ایچ پی ممبران کی آپس کی باتوں کے فون ریکارڈ موجود تھے بالآخر 'گم' ہوگئی تھیں۔ لیکن فسادات کے بارے میں انکوائری کے لیے مارچ ۲۰۰۲ء میں قائم کی گئی ناناوتی کمیشن کے سامنے حاضری کے وقت شرما نے اس سی ڈی کی ایک کاپی جمع کر دی جس کو انھوں نے اپنے پاس محفوظ رکھا تھا۔ (۱۴)

میری رفیق کار انو میہا یادو نے تہلکہ میں شائع اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا کہ:

> مجرم کو پھانسنے کے لیے یہ فون ریکارڈ اہم ترین ثبوتوں میں سے رہے ہیں۔ انہی ثبوتوں کی بنیاد پر ۲۰۰۹ء میں گجرات وی ایچ پی صدر جے دیپ پٹیل اور وزیر مایا کوڈنانی کی ضمانتیں رد کی گئیں اور انھیں گرفتار کیا گیا تھا۔ انہی ثبوتوں سے گلبرگ سوسائٹی میں سابق کانگریسی ممبر پارلیمنٹ احسان جعفری اور دیگر تیس افراد کے قتل کے معاملے میں تحقیقات کے دوران بھی کام لیا گیا۔ یہ سی ڈیز نرودا پٹیا میں برپا ہونے والے تشدد کے معاملے میں بھی اہم ثبوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۰۵ مسلمان مارے گئے تھے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ منصفانہ تحقیقات کی کسی بھی کوشش کو ناکام بنانا گجرات میں ایک قاعدہ بن چکا ہے۔ شرما کو نوٹس ملنے سے ایک ہفتے قبل ہی ایک دوسرے

آئی پی ایس افسر ستیش شرما جو ایک علیحدہ ایس آئی ٹی کے ممبر ہیں اور جس کو ۲۰۰۴ء کے عشرت جہاں انکاؤنٹر معاملے کی انکوائری کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کیس کے سراغوں کا تعاقب کرنے سے ان کو روکا جا رہا ہے۔ ورما جو اس انکاؤنٹر کی تحقیقات کرنے والے تین افسروں میں سے ایک ہے جس کو مبینہ طور پر گجرات پولیس نے اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے انجام دیا تھا، انھوں نے ایک خفیہ بیان بھی جمع کیا تھا جس میں ان کے کام میں مداخلت کی مثالوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۲۸ جنوری کو گجرات ہائی کورٹ میں پیش کیے گئے ۸۰ صفحات پر مشتمل حلفیہ بیان میں ورما نے بتایا تھا کہ کس طرح واضح فارنسک ثبوت کو ۲۰۰۹ء میں گجرات حکومت کے ذریعے قائم کردہ سابق ایس آئی ٹی نے نظر انداز کر دیا تھا۔ عشرت کے جسم میں پائی جانے والی وہ گولیاں بھی اسی ثبوت میں شامل تھیں جو ان ہتھیاروں سے میل نہیں کھا رہی تھیں جن کے بارے میں پولیس کا دعویٰ تھا کہ انکاؤنٹر میں ان کا استعمال ہوا تھا۔ ورما نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح سے گجرات کیڈر کا افسر موہن جھا، جو ایس آئی ٹی کا سابق ممبر بھی تھا اور اسی طرح دہلی کیڈر کا افسر کرنیل سنگھ ان دونوں نے جان بوجھ کر ایک کلیدی گواہ کے اپنے قول سے پھر جانے کے معاملے کو کسی تبصرے کے بغیر ہائی کورٹ کے سامنے پیش کر دیا تھا تاکہ شک اور ابہام پیدا کیا جا سکے۔ ورما نے اس بات کا انکشاف بھی کیا تھا کہ کس طرح جھا نے، جو ابھی جرم کا سراغ لگانے والے شعبے ڈی سی بی میں جوائنٹ کمشنر آف پولیس کے عہدے پر فائز ہے، پچھلے مہینے ۲۶ پولیس افسران کو بلاواسطہ اپنی ماتحتی میں اسپیشل آپریشن گروپ میں رکھنے کی کوشش اس دعوے کے ساتھ کی کہ 'درخشاں گجرات' چوٹی کانفرنس کی سیکورٹی کے لیے ان افسروں کی ضرورت ہے۔ یہ سبھی ۲۶ افسر انکاؤنٹر کے دن ڈی سی بی میں کام کر رہے تھے۔

ورما کہتے ہیں کہ جب سے ایس آئی ٹی نے اپنا کام کرنا شروع کیا اس کے ۱۹ دن بعد دسمبر کے مہینے میں ایس آئی ٹی میں جاری کام کاج کے بارے میں انھوں نے ایک سرکاری نوٹ بنانا

شروع کر دیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں تمام بد انتظامی کا ریکارڈ تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور پہلے ہی سے خدشہ تھا کہ منصفانہ تحقیقات کی راہ میں کی جانے والی ان کی کوششوں کو روکا جائے گا۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان فرضی انکاؤنٹروں میں کیے گئے قتل کی تحقیقات کی کوشش کتنی پُر پیچ ہے۔ یہ بات ایک اعلیٰ پولیس افسر نے اس شرط پر بتائی کہ ان کی شناخت مخفی رکھی جائے۔ (۱۵)

فسادات کے بعد وقوع پذیر ہونے والے فرضی انکاؤنٹروں کے بارے میں اشوک نارائن بڑی روانی سے بول رہے تھے۔

سوال: انکاؤنٹروں کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟

جواب: انکاؤنٹر مذہب کی بنیاد پر کم اور سیاسی بنیادوں پر زیادہ کیے جاتے ہیں۔ سہراب الدین انکاؤنٹر کے معاملے کو ہی لے لو۔ اس کا قتل سیاسی لیڈروں کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ اسی معاملے کی وجہ سے امت شاہ سلاخوں کے پیچھے ہے۔
ایسا ہر جگہ ہوتا ہے اور یہاں بھی وہی ہو رہا ہے۔ فرضی انکاؤنٹرز یا تو سیاسی محرک کی وجہ سے ہوتے ہیں یا پھر پولیس والوں کے بیجا جوش و خروش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

سوال: جب آپ داخلہ سکریٹری تھے کیا اس دوران فرضی انکاؤنٹر نہیں ہوئے؟

جواب: سہراب الدین والا (انکاؤنٹر) تو نہیں ہوا۔ بس ایک ہوا تھا، میں نے افسروں سے کہا تھا کہ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس کے پیچھے ضرور سیاسی محرک کارفرما ہو گا۔ میں نے ڈی جی پی سے کہا: 'تم لوگ یہ کر کیا رہے ہو؟'

سوال: فسادات کے دوران حقیقت میں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں آپ کو ایک کتاب لکھنی چاہیے۔

جواب: لیکن میرا اعتبار کون کرے گا؟

سوال: آپ تو داخلہ سکریٹری تھے؟

جواب کانگریس والے کہیں گے کہ تم سرکار کا حصہ تھے، اس لیے سرکاری پہلو کے بارے میں لکھ دیا ہے۔ بی جے پی والے بھی میری بات سے اتفاق نہیں کریں گے۔ سیاسی پارٹیاں وہی چیزیں مانتی ہیں جو وہ ماننا چاہتی ہیں۔

اشوک نارائن کے ساتھ یہ میری آخری ملاقات تھی۔ انھوں نے تقریباً ہر اس شے کی تصدیق کر دی تھی جس کے بارے میں برسوں سے افسروں کے ساتھ ریکارڈ سے پرے گفتگو میں سنتی آرہی تھی مثلاً بعض افسروں نے سرکار کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے عوض میں انھیں انعامات سے نوازا گیا۔ بقیہ دیگر افسران کا تبادلہ کر دیا گیا۔ بحث کے طور پر اگر مان بھی لیں کہ اشوک نارائن اپنی ذاتی رائے اور فیصلے کی بنیاد پر بات کر رہے تھے تب بھی مودی سرکار کا انتظامیہ کے خلاف جانے والے افسروں کے تئیں انتقامی جذبہ اور ان کا تبادلہ ایک ایسی بات ہے جو سب پر عیاں ہے۔ راہل شرما، رجنیش رائے، منیش ورما اور کلدیپ شرما جیسے افسروں کے بیس بیس سال پرانے معمولی معمولی معاملوں کو نکال کر ان کے خلاف استعمال کیا گیا۔ یہ وہ افسر تھے جنھوں نے عدل و انصاف کا پرچم ایسے وقت میں بلند رکھنے کی کوشش کی تھی جب گجرات میں عدل و انصاف بری طرح ہچکولے کھا رہے تھے۔ اور اس کی وجہ سے آج تک ان کو ستایا جا رہا ہے۔

آنے والے صفحات میں ہم دیکھیں گے کہ کلدیپ شرما کو جسے گجرات کا ڈی جی بننا چاہیے تھا کس طرح ترقی سے صرف اس لیے محروم رکھا گیا کہ اس نے اس وقت کے وزیر داخلہ امت شاہ کے خلاف مادھو پورہ کو آپریٹیو معاملے میں تحقیقات کرنا شروع کر دیا تھا۔ راہل شرما کو معطل کیا گیا اور اس کے خلاف مقدمے دائر کر دیے گئے کیوں کہ ایک مدرسے میں اس نے فسادیوں کو روکا تھا اور بعد میں گجرات فسادات کے دوران مختلف وزرا کے فون ریکارڈ تحقیقاتی کمیشنوں کے حوالے کیے تھے۔ غبار چھٹنا بس ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ اشوک نارائن نے اس ریاست کی جانب داری اور سازباز کی تصدیق تو کر ہی دی تھی

جہاں تین مہینے تک چلنے والے ایک نہایت خطرناک فساد کے دوران خون بہانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

اب وقت آچکا تھا کہ نئے کردار اور نئے باب کا رُخ کیا جائے۔



باب ہفتم

جی سی رائیگار

۲۰۰۲ء فسادات کے دوران گجرات انٹیلی جنس کے سربراہ اور سہراب الدین انکاؤنٹر کے وقت ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر فائز رہ چکے جی سی رائیگار سے میری ملاقات ایک ایسے دن ہوئی جب مجوزہ ہند و پاک کرکٹ مقابلے کو لے کر ہر شخص پُرجوش نظر آرہا تھا۔ اجے نے اپنے گھر پر ہی میچ کی اسکریننگ کا انتظام کیا تھا۔ اس کے اکثر دوست وہاں آنے والے تھے۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی تھی۔ میرا من تو بہت چاہا کہ جاؤں لیکن اجے کے دوستوں کے روبرو ہونے سے میں نے احتراز کیا، کیوں کہ ان میں سے بہتوں کے مضبوط سیاسی تعلقات تھے۔ مقصد یہ تھا کہ میری شناخت کا پردہ فاش نہ ہو۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی ایک قریبی دوست انار پٹیل ہے جو شہر میں ایک غیر سرکاری تنظیم (این جی او) چلاتی ہے، انار پٹیل گجرات کی وزیر اعلیٰ آنندی بین پٹیل کی بیٹی ہے۔

اس دوپہر کو جب میں رائیگار سے ملنے کے لیے پہنچی تو وہ کرکٹ مقابلے کے آغاز کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا: 'سر، آفریدی چھکے لگانا نہ شروع کر دے۔ کیوں کہ ہماری بالنگ زیادہ مضبوط نہیں ہے۔' رائیگار نے راجستھانی چیوڑا اور چائے پیش کی اور پھر گجرات آئی بی میں اپنی سربراہی کے دنوں کے بارے میں مزے سے باتیں کرنے لگا۔ اخبار میں شائع خبروں کے مطابق وہ سہراب الدین فرضی انکاؤنٹر میں سی بی آئی کے سامنے پیش ہو چکا تھا اور ان دنوں وہ بڑے دباؤ میں تھا۔ (۱۶)

اس ملاقات تھی جس کے متعلق مجھے بہت اندیشے تھے کیوں کہ مجھے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ رائیگار کس پالے میں ہے، اور اس سے کتنی سچائی اگلوائی جا سکتی ہے۔ مائیک واپس آچکا تھا اور ہم ایک بار پھر نہرو فاؤنڈیشن میں منتقل ہو گئے تھے۔ ہماری ملاقات رائیگار سے اس کے دفتر میں ہوئی جہاں سبکدوشی کے بعد اس کو زہریلی شرابوں سے متعلق معاملوں کی چھان بین کے لیے نوکری دی گئی تھی۔ ۲۰۰۲ء گجرات فسادات کے دوران انٹیلیجنس میں ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر فائز رہ چکے آر بی سری کمار نے فسادات کے بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

> صرف اوپر کے لوگوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سے افسران نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ یہاں تک کہ میرے پیش رو جی سی رائیگار بھی پیچھے ہٹ گئے اور میرے ماتحت ہونے کے باوجود نہ صرف اس کو ترقی سے نوازا گیا بلکہ سبکدوشی کے بعد اس کو ایک ہائی کورٹ جج کے ماتحت زہریلی شراب کمیشن میں ممبر کے طور پر عہدہ بھی دیا گیا۔

رائیگار کا ذکر بھٹ نے سپریم کورٹ میں پیش کردہ اپنے حلفیہ بیان میں کیا تھا، اس نے نہ تو اس بات کی تصدیق کی اور نہ ہی انکار کیا کہ ۲۷ فروری ۲۰۰۲ء کو وزیر اعلیٰ کی میٹنگ میں بھٹ حاضر ہوا تھا یا نہیں۔ ایک مقامی اخبار سے اس نے بس اتنا کہا تھا: 'میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس دن میں چھٹی پر تھا۔'

بھٹ نے اپنے حلفیہ بیان میں اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس چکرورتی کا بھی ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ انھوں نے ہی اُسے میٹنگ میں حاضر ہونے اور مدد کرنے کو کہا تھا۔ لیکن وہ ۲۰۰۲ء فسادات کی تحقیقات کے بارے میں میڈیا سے بات کرنے سے انکار کر چکے تھے، ان سے کسی طرح کا سراغ ملنے کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔

گجرات فسادات اور اس کے بعد واقع ہونے والے فرضی انکاؤنٹر معاملوں میں رائیگار ایک

کلیدی شخص کی حیثیت رکھتا تھا۔ دونوں ہی واقعات افسوس ناک ہونے کے ساتھ ساتھ گجرات میں جاری مجرمانہ سازش کی واضح مثال بھی ہیں۔ سہراب الدین انکاؤنٹر کی تحقیقات کے دوران کام کرنے والے ایک پولیس افسر وی ایل سولنکی نے سی بی آئی کو ایک تحریری بیان دیا تھا جس کو بعد میں چارج شیٹ میں بھی شامل کیا گیا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ:

> نومبر ۲۰۰۶ء کے پہلے ہفتہ میں انھوں (گیتا جوہری، آئی جی) نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا تھا اس لیے میں گاندھی نگر گیا۔ شروع میں انھوں نے انکوائری کی پیش رفت کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہنے لگیں کہ اس دن ایک زبردست واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ریاستی وزیر برائے داخلہ شری امت شاہ نے اُن کو ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل آف پولیس شری جی سی رائیگار اور ڈائرکٹر جنرل آف پولیس شری پی سی پانڈے کے ہم راہ اپنے دفتر میں بلایا تھا اور انکوائری کی پیش رفت کے بارے میں سب سے بات کی۔
>
> میڈم نے مجھے بتایا کہ ریاستی وزیر برائے داخلہ کا موڈ بہت خراب تھا، اس نے میرے بارے میں ان سے پوچھ گچھ کی اور کہا کہ مجھ جیسا پولیس افسر کیسے ہمت کر سکتا ہے کہ ایسی رپورٹیں تیار کرے جن کی وجہ سے شری ڈی جی ونجارا اور راجکمار پانڈیان جیسے اعلیٰ افسران جو سہراب الدین انکاؤنٹر کے لیے ذمہ دار تھے بڑی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔

میٹنگ کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے سی بی آئی سے کہا تھا کہ دسمبر ۲۰۰۶ء میں امت شاہ نے اس وقت کے گجرات کے ڈی جی پی پی سی پانڈے، اے ڈی جی پی برائے سی آئی ڈی جی سی رائیگار اور آئی جی پی برائے سی آئی ڈی گیتا جوہری جو اس وقت معاملے کی رہنما تحقیق کار تھی، کے ساتھ جو میٹنگ کی تھی اس میں امت شاہ نے مبینہ طور پر مطالبہ کیا تھا کہ جوہری کے نائب سولنکی کے ذریعے تیار کردہ الزام آور تفتیشی رپورٹوں (incriminating investigative reports) میں تحریف کر دی جائے۔ لیکن سولنکی

نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پرجاپتی سے انٹرویو لینے کی کوشش کی تھی کیوں کہ پرجاپتی، سہراب الدین اور کوثربی دونوں کے اغوا کا گواہ تھا۔ پرجاپتی نے نومبر ۲۰۰۶ء میں کھلے کورٹ میں چلاّ کر کہا تھا کہ پولیس اس کو مار ڈالنے والی ہے کیوں کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد، قبل اس کے کہ وہ سولنکی سے بات کر پاتا، اس کو بھی انکاؤنٹر میں مار دیا گیا۔

تفتیش شروع ہونے کے اٹھارہ مہینے بعد داخل کی گئی چارج شیٹ میں سی بی آئی نے شاہ اور ۱۹ دیگر ملزمین کے نام شامل کیے۔ چارج شیٹ میں جن کے نام درج کیے گئے تھے ان میں پانڈے، جوہری، اوپی ماتھر، راجکمار پانڈیان، ڈی جی ونجارا اور آر کے پٹیل جیسے اعلیٰ افسران شامل تھے۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے سازش کے تحت پرجاپتی کو راستے سے ہٹا دیا تھا جو فرضی انکاؤنٹر میں مجرم گروہ کے سرغنہ سہراب الدین شیخ کے قتل کا گواہ تھا۔ گجرات کیڈر کے نو آئی پی ایس افسران بطور گواہ شامل کیے گئے تھے۔ ان کے نام ہیں: جی سی رائیگار (جو اس وقت سی آئی ڈی کرائم برانچ میں اے ڈی جی پی تھا)، رجنیش رائے، آئی ایم دیسائی (اس دوران سی آئی ڈی کرائم میں تھا اور معاملے کی نگرانی کر رہا تھا)۔ پی پی پانڈے (اے ڈی جی پی، سی آئی ڈی کرائم)، وی وی رابڑی (سابق سربراہ برائے سی آئی ڈی کرائم) راجن پریادرشی (سبکدوش) سدھیر سنہا (اس زمانے میں ریاستی آئی بی کا سربراہ) اے۔ کے شرما (ڈی آئی جی کرائم برانچ احمد آباد) اور میور چوڈا (ڈی ایس پی، سیکورٹی برائے وزیر اعلیٰ)۔

سی بی آئی افسران کے مطابق رائیگار اور رائے بہت اہم گواہ ہیں۔

چارج شیٹ میں ذکر کیا گیا تھا کہ وسط دسمبر ۲۰۰۶ء میں امت شاہ (جو اس وقت ریاستی وزیر برائے داخلہ تھا) نے اپنے دفتر میں ایک میٹنگ بلائی تھی جس میں پانڈے، جوہری اور رائیگار حاضر تھے۔ اس میٹنگ کا مقصد شیخ کے معاملے میں جاری تحقیقات پر ناراضگی کا اظہار کرنا تھا۔ شاہ نے جوہری سے کچھ خاص دستاویزات کو ضائع کرنے کے لیے کہا تھا۔

سی بی آئی نے بتایا کہ رائیگار نے تو یہ گزارش کر لی تھی کہ اُسے اس سے باہر ہی رہنے

دیا جائے لیکن پانڈے اور جوہری ان سازشی احکامات کے ایسے ممبران تھے جنھوں نے خوشی خوشی اس معاملے میں ساتھ دیا تھا۔

رائیگار نے سی بی آئی کو بتایا کہ جب وہ سہراب الدین فرضی انکاؤنٹر معاملے کی جانچ پڑتال کا ذمہ دار تھا تب جونیئر وزیر داخلہ امت شاہ کی طرف سے اس پر لگاتار دباؤ رہتا تھا۔ 'وہ میرے کام سے خوش نہیں تھا کیوں کہ وہ مجھ سے کچھ غیر قانونی کام کروانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں بہت دباؤ میں آ گیا۔ لہٰذا میں نے تبادلے کی درخواست دے دی اور وزیر داخلہ نے بھی بلا تاخیر اسی دن میرے تبادلہ کا حکم جاری کر دیا۔'

ایک دوسرے افسر او پی ماتھر کو میری جگہ چارج دیا گیا۔ میں نے شاہ سے درخواست بھی کی کہ تبادلے کے نفاذ کے لیے کچھ دن کی مہلت مجھے دے لیکن وہ راضی نہیں ہوا اور اسی دن میرا تبادلہ کر دیا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دنوں معاملے کی تحقیقات کرنے والے پولیس انسپکٹر وی ایل سولنکی نے مجھ سے کبھی بھی کیس کے سلسلے میں اُدے پور جانے کی اجازت نہیں لی تھی۔ اس وقت کے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل آف پولیس او پی ماتھر نے اپنے بیان میں کہا کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس جی بی پدھیریا اور آئی جی گیتا جوہری کے درمیان نا اتفاقی ہو گئی تھی کیوں کہ جوہری کو شک تھا کہ گواہ نتھو بھا جڈیجہ کے انحراف کے پیچھے پدھیریا کا ہاتھ ہے۔ یہ سارا معاملہ پرنسپل سکریٹری (داخلہ) کے علم میں لایا گیا، جس نے یہ کہہ دیا کہ وہ لوگ آپس میں اس مسئلہ کو سلجھا لیں۔ بعد میں یہ معاملہ حل کر بھی لیا گیا۔ البتہ جوہری نے اس کو اعتماد میں نہیں لیا۔ یہ بات اس نے سی بی آئی کو بتائی۔

ان بیانات کی تفصیل تب سامنے آئی جب میں اپنے خفیہ مشن کے بعد مارچ ۲۰۱۱ء میں گجرات چھوڑ چکی تھی۔

دسمبر کے مہینے میں جب مائیک کے ساتھ رائیگار کے آفس میں اس سے ملنے کے لیے

گئی تب بھی سی بی آئی اُسے پوچھ تاچھ کے لیے بلایا کرتی تھی۔ معاملے کی حساسیت کے بارے میں مائیک کو میں نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے اس سے یہ بھی بتایا کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ہم اس سے کچھ بھی نہ اگلوا پائیں۔ 'چلو مائیک! آج اُس سے سیاست کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھیں گے بس فرنگیوں کی طرح برتاؤ کرتے ہوئے بہانے بنائیں گے جیسے کہ ہم بالکل بے خبر ہیں۔'

رائیگار کو مائیک بہت پسند آیا تھا۔ گجرات میں اس کے تجربے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مائیک نے بھی اُسے آمداوادنی گپھا، پالدی اور سرکھیج روزا جیسے مقامات پر اپنی شوٹنگ کے بارے میں مختصر طور پر بتایا۔ مجھے پختہ طور پر معلوم نہیں کہ یہ صرف گجراتیوں کا معاملہ ہے کہ وہ ہر بیرونی یا امریکی چیز پر فریفتہ ہو جاتے ہیں یا اس میں ہمارے ذریعہ ظاہر کی گئی خود اعتمادی کا دخل تھا جس کی بدولت یہ افسران اتنی آسانی سے ہماری کہانی کو مان لیتے تھے۔

بالی ووڈ کے گجراتی فلم ساز راہل ڈھولکیا کے ساتھ کی گئی گفتگو مجھے یاد آتی ہے۔ اس کی گجرات فساد پر مبنی فلم پرزانیا کو ریاست کے سنیما گھروں میں دکھانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ممبئی کے جوہو میں واقع کوسٹا کافی میں بیٹھ کر راہل نے ہنسا ہنسا کر میرا بُرا حال کر دیا تھا جب اس نے پرزانیا کو فلمانے اور فنڈ حاصل کرنے کے دوران ہونے والے تجربے سے متعلق دل چسپ کہانیاں خوب مزے لے لے کر سنائے تھے۔ جب تک دائیں بازو والی ہندو جماعتوں نے فلم کے خلاف احتجاج نہیں کیا تب تک اس کے پروڈیوسر کو اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ یہ فلم فسادات کے دوران ریاست میں اقلیتوں کے خلاف برتی گئی ناانصافی پر مبنی ہے۔ راہل نے ایک امریکی چینل کے ساتھ کام کیا تھا لہٰذا اس نے یہ کارڈ استعمال کیا کہ وہ غیر مقیم بھارتیوں کے لیے گجرات پر ایک فلم بنا رہا ہے۔ جتنے لوگوں سے گجرات میں میری ملاقات ہوئی سب کے سامنے میں نے بھی وہی کہانی دہرائی۔ فلم کے پروڈیوسروں اور متعلقہ اتھارٹیوں کو ڈھولکیا پر اعتماد کرنے کی خاطر اتنا پس منظر کافی تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اس کو فلم

کے لیے گجرات فسادات کی فوٹیج درکار تھی لہٰذا اس نے ایک اخبار سے رابطہ کیا جس کے پاس مطلوبہ ٹیپ موجود تھے۔ اخبار کے آفس کا ذمہ دار شخص اس بات سے ہی متاثر ہو گیا کہ وہ امریکہ کا رہنے والا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ جس بات سے وہ متاثر ہوا تھا وہ یہ تھی کہ ڈھولکیا کے دادا ہندو مہاسبھا کے چیئر مین تھے۔ لہٰذا اس کو جن چیزوں کی بھی ضرورت پڑی ان تک رسائی کی اجازت فوراً دے دی گئی۔

لیکن سر دست دشواری رائیگار سے نمٹنا تھا۔ ہم سے پہلی ملاقات میں وہ بات کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ راضی تھا۔ مجھے پدرانہ لکچر سے بھی نوازا تھا کہ میں اپنی شادی کو مزید نہ ٹالوں کیوں کہ ایک عمر کے بعد لڑکی کو متوقع رشتہ ملنے میں دقت ہوتی ہے۔ رائیگار راجستھان کی ایک قدیم روایات پر عمل پیرا خاندان کا فرد معلوم ہو رہا تھا۔ امت شاہ کے خلاف معاملے میں اس کے عتاب کے ڈر سے گواہ بننے میں اس کو دقت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن فرضی انکاؤنٹر معاملے میں روز بروز شاہ کے خلاف اکٹھے ہوتے ہوئے ثبوتوں کو دیکھتے ہوئے رائیگار نے آخر کار گواہ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ہماری گفتگو کے دوسرے دن رائیگار نے جن حقائق کا انکشاف کیا وہ حیران کن تھے۔

فرضی انکاؤنٹروں میں استعمال ہونے والے کرداروں کی فہرست سے میں باخبر تھی لیکن ہر کردار کا استعمال جتھے کے ذریعے جس طرح سے کیا گیا تھا اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ رائیگار مطمئن تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ میں پی سی پانڈے، اشوک نارائن اور راجن پریادرشی سے بات کر چکی ہوں۔ اس کو اس بات کا بھی یقین ہو چکا تھا کہ میں اپنی فلم میں عظیم گجرات پولیس فورس کا احاطہ کر رہی ہوں۔

میں نے بھج زلزلے کے متعلق اس سے بات کی تو زلزلے کی شدت کے متعلق اس نے اپنے تاثرات بتائے۔ کتنی جانیں ضائع ہوئیں اور زلزلے کے بعد گجرات پولیس نے کتنا مشکل کام انجام دیا تھا اس کی تفصیل بتائی۔ اعلیٰ درجے کے بھول پن کا اظہار کرتے ہوئے میں

نے اس سے پوچھا کہ کیا گجرات صحیح معنی میں اتنا منتشر ہے جیسا کہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس نے کہا 'آں، آپ کو بالکل اندازہ نہیں ہے ۲۰۰۲ء میں یہاں کیا ہوا تھا۔' جب اس نے فسادات کے بارے میں بولنا شروع کیا تو میرے بھول پن کا نظارہ کھلے تجسس میں بدل گیا۔ میں نے اس کو بتایا کہ دیگر افسران سے بھی اس بارے میں کچھ نوٹس میں نے اکٹھے کیے ہیں۔ رائیگار انٹیلی جنس کا سربراہ رہ چکا تھا اس کا مطلب ہے کہ گجرات فسادات کے دوران وہ ایک اہم عہدہ پر فائز تھا۔

سوال: لیکن آپ مجھے مودی والا حصہ بتایئے کیوں کہ ہر شخص اسی کو ذمہ دار مانتا ہے؟

جواب: اس کے بارے میں مجھ سے مت بلواؤ۔ ابھی ابھی میں اس سے باہر آیا ہوں۔

سوال: جب یہ سب کچھ چل رہا تھا کیا تب آپ اس کے بیچ تھے؟

جواب: ہاں میں تھا۔

سوال: بڑی دکھ بھری کہانی ہے نا؟

جواب: ہاں، فسادات کے ان تین مہینوں کو میں بھلا دینا چاہتا ہوں کیوں کہ کچھ ایسی چیزیں واقع ہوئی تھیں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔

سوال: واقعی؟ کیا آپ کے ضمیر کو بھی چوٹ پہنچی ہے؟

جواب: ہاں۔ بالکل، بالکل۔

سوال: اشوک نارائن بھی یہی کہہ رہے تھے؟

جواب: ہاں، وہ بھی حالات سے گھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں اب بھی وہ حادثہ تازہ ہے۔ اور ہر جگہ اس کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اتنا مقبول ہونے کے باوجود امریکہ ابھی بھی اس کو (مودی) اپنے یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ اتنا مقبول ہونے کے باوجود بھی۔ حال ہی میں وکی لیکس میں یہ بات آئی تھی کہ امریکہ اب اس کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا چاہتا ہے لیکن بعد میں اسی وکی لیکس نے مودی

کے بارے میں منفی باتیں بھی کہی تھیں۔ البتہ میڈیا کو اس نے صرف اچھی باتوں کے بارے میں بتایا۔

سوال: کیا ملک کا یہ بدترین فساد تھا؟ ممبئی سے بھی بُرا؟

جواب: ہاں، ممبئی فساد تو صرف دو دن کے لیے تھا۔ لیکن یہاں والا تو لگاتار کئی مہینوں تک جاری رہا۔

سوال: لیکن کیسے؟ اتنی لمبی مدت تک جاری رہنے کی اجازت کیوں دی گئی؟

جواب: نارائن نے تم کو بتایا ہی ہو گا کیوں کہ اس زمانے میں وہی داخلہ سکریٹری تھا۔

سوال: ہاں، انھوں نے بتایا تھا کہ وہ بہت پریشان تھے۔ سرکار کی بڑی تنقید کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ریاستی حکومت نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔

جواب: وہ داخلہ سکریٹری تھے۔ سرکار کا سب سے اہم کارندہ، اس لیے جو کچھ بھی وہ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی ہو گا۔

سوال: لیکن کیا آپ تمام لوگ مایوس تھے؟

جواب: ہاں، ہم میں سے اکثر لوگ مایوس اور دکھی تھے۔ بس وہی لوگ دکھی نہیں تھے جو سرکار کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ انھوں نے سرکار کا ساتھ دیا تھا۔ صرف سیاسی لیڈران ہی کھیل نہیں کھیل رہے تھے، پولیس والے بھی ذمہ دار تھے۔

سوال: تو کیا فسادات کے دوران سیاسی لیڈران اور پولیس کے بیچ سانٹھ گانٹھ جیسا معاملہ تھا؟

جواب: ہاں لیکن محدود پیمانے پر۔ کیوں کہ حالات اگر ایک بار ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سوال: لیکن اس نے (مودی) تو اس واقعہ سے بہت سیاسی فائدہ حاصل کیا؟ آج وہ جو کچھ بھی ہے فسادات ہی کی وجہ سے ہے؟

جواب: اوہ ہاں، بالکل، دوسرے ہی الیکشن میں وہ بہت پریشان تھا لیکن یہ معاملہ کام آگیا۔
لوگوں نے سوچا کہ یہ سب کچھ اس نے ان لوگوں کے لیے ہی کیا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہی گفتگو کا رخ فرضی انکاؤنٹر کی طرف مڑ گیا۔ جب تحقیقات کی گئی تھیں تب رائیگار ایڈیشنل ڈی جی پی (ڈائرکٹر جنرل آف پولیس) ہوا کرتا تھا۔ فرضی انکاؤنٹر کے بارے میں اس سال کے مئی اور جون کے مہینوں میں سی بی آئی نے روزانہ دس دس گھنٹوں سے بھی زیادہ اس سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ پھر بھی وہ اس بات سے خوش تھا کہ کہانی میں اپنا پہلو وہ مجھ سے شیئر کر رہا تھا۔

سوال: یہاں انکاؤنٹر کا کیا معاملہ ہے؟ کیا آپ وہاں موجود تھے؟

جواب: بس ایک انکاؤنٹر میں موجود تھا۔ سہراب الدین نامی ایک مجرم کو فرضی انکاؤنٹر میں مار ڈالا گیا تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے اس کی بیوی کو بھی مار دیا۔

سوال: کوئی وزیر بھی اس میں ملوث تھا؟

جواب: وزیر داخلہ امت شاہ۔

سوال: اس کی ماتحتی میں کام کرنا تو بڑا مشکل رہا ہوگا؟

جواب: ہم اس کے ساتھ اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ ہی ہم اس کے احکامات مانتے تھے۔ اس لیے انکاؤنٹر معاملوں میں گرفتار ہونے سے ہم بچ گئے۔

سوال: کیا ہر جگہ حالات اتنے ہی بُرے ہیں؟

جواب: دس سال قبل گجرات بہت اچھا ہوا کرتا تھا۔

سوال: کیا سیاسی بدلاؤ کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے؟

جواب: جمہوریت میں اگر ایک شخص کا قد بہت اونچا ہو جاتا ہے تو یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ جیسا کہ وزیر داخلہ (امت شاہ) کا معاملہ ہے۔ تبادلہ، تعین اور ترقی سب اس کی مٹھی میں ہے۔ اگر کوئی اس کا کام نہیں کرتا ہے تو اس کو سائڈ پوسٹنگ پر بھیج دیا جاتا ہے اور

کوئی سائڈ پوسٹنگ پر جانا نہیں چاہتا۔ اس لیے سہراب الدین معاملے کے دوران میں نے تبادلے کے لیے درخواست دی تھی۔

سوال: کیا تبادلہ اس لیے کیا گیا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ تحقیقات کریں؟

جواب: نہیں، کیوں کہ میں غلط طریقے سے تحقیقات کرنا نہیں چاہتا تھا؟

سوال: اور وہ چاہتے تھے کہ آپ غلط طریقے سے تحقیقات کریں؟

جواب: ہاں۔

سوال: کوئی آدمی یہ سب کیسے کروا سکتا ہے؟ امت شاہ کو بچ کر نکل جانے کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟

جواب: وہ راستہ نکال لیتا ہے کیوں کہ وہ طاقت ور لوگوں کے قریب ہے۔

سوال: کیا وہ وزیر اعلیٰ کے قریب تھا؟

جواب: ہاں، وہ وزیر اعلیٰ کے بے حد قریب تھا۔ اس سے زیادہ وزیر اعلیٰ کے قریب کوئی نہیں تھا۔

سوال: تو کیا وزیر اعلیٰ اس کو گرفتاری سے نہیں بچا سکا؟

جواب: وہ یہ نہیں کر سکتا تھا (ثبوت اس کے خلاف تھے)

سوال: ہاں، اگر ایسا کرتا تو خود بھی پھنس جاتا؟

جواب: اگر وہ مداخلت کرتا تو اس کو جانا پڑتا۔ یہ آدمی (وزیر اعلیٰ) اس حساب سے چالاک ہے۔ اس کو سب کچھ پتا تھا لیکن اس نے دوری بنائے رکھی اس لیے اس کو اس معاملے میں پکڑا نہیں گیا۔

قانون نام کی چیز موجود ہے، انکاؤنٹر پر انکاؤنٹر تم نہیں کر سکتے۔ خواہ سبب جو بھی ہو لیکن لوگوں کا تم قتل نہیں کر سکتے، البتہ ان وزیروں کے لیے یہ سب بہت آسان ہے۔ وہ آزاد پھرتے ہیں۔ ان کو دستخط نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ بس زبان سے کہہ کر

Salman

کام کرواتے ہیں۔ اب ٹکنالوجی کی وجہ سے یہ اور بھی آسان ہو گیا ہے۔ وہ ایسے فون کا استعمال کرتے ہیں جس کو ٹریک کیا جا سکتا ہے۔

سوال: ہاں، آپ کے معاملے میں ہی پڑھ رہی تھی کہ کچھ کال ریکارڈ کی وجہ سے ہی وزیر کو گرفتار کیا گیا تھا۔

جواب: ہاں۔

سوال: جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس کے برعکس کیا راست باز افسران ریاست میں موجود ہیں؟

جواب: ہاں، ہاں۔ بہت ہیں۔ لیکن تباہی کے لیے تم کو صرف کچھ ہی گندی مچھلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بھی کچھ اچھے افسران موجود ہیں جن کی وجہ سے اب وزرا کی گرفتاری ہو رہی ہے۔

سوال: ہاں۔ کسی نے مجھے راہل شرما نامی افسر سے ملنے کا مشورہ دیا ہے۔ بظاہر وہ راست باز معلوم ہوتا ہے اور اسی لیے سرکار کے چہیتوں میں شامل نہیں ہے۔

جواب: مسلمانوں کی زندگی بچانے کی وجہ سے (سرکار کی) اس پر کڑی نظر ہے۔ اس نے ایک اسکول میں مسلم بچوں کی جان بچائی تھی۔ صرف بچایا ہی نہیں تھا بلکہ اس نے کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کیا تھا اور چوں کہ اس نے برسر اقتدار پارٹی کے ممبر کو گرفتار کر لیا اس لیے اس کے عہدے سے اس کا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔

سرکار کی جانب سے ایک دقت تھی، شروع میں ان کو احساس نہیں تھا کہ معاملہ اتنا بگڑ جائے گا۔ شروع میں فسادیوں کے خلاف وہ قوت کا استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حالات بے قابو ہو گئے۔

سوال: کیا یہ بات سچ ہے کہ مسلم مخالف ہندوؤں کے تئیں وہ نرمی سے کام لینا چاہتے تھے؟

جواب: شروع میں تو ایسا ہی تھا۔ ان کو احساس نہیں تھا کہ یہ اتنا بُرا ہو جائے گا لیکن تم نے جو

بات کہی ہے وہ سچ ہے۔

سوال: لیکن کیا یہ سچ ہے کہ آپ افسروں سے کہا گیا تھا کہ ہندوؤں اور فسادیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں؟

جواب: ہم سے نہیں، عام طور سے ایسا نہیں کہا گیا تھا، بس ان لوگوں کو بولا گیا تھا جو ان کے کام کے تھے اور خاص جگہوں اور اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ان کو خاص علاقوں میں تعینات کیا گیا تھا۔ ان تک یہ بات پہنچادی گئی تھی۔

سوال: مودی سے پہلے ایک وزیر اعلیٰ ہوا کرتا تھا جس کا نام کیشو بھائی پٹیل تھا، وہ کیسا آدمی تھا؟

جواب: مودی کے مقابلہ میں تو وہ ایک سادھو تھا۔ بس موازنہ کے طور پر۔ میرا مطلب ہے کہ کیشو بھائی جان بوجھ کر کبھی کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ دھرم چاہے جو بھی ہو۔ صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کا نقصان وہ نہیں ہونے دیتا۔

سوال: لیکن سر، ایک غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے بہت سی حقیقتوں کو افسانے کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے؟

جواب: تم جانتی ہو کہ یہ مشکل کام ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ سیدھے سیدھے احکامات نہیں دیتے ہیں۔ یہ لوگ پس پردہ ہوتے ہیں۔ ذرا قانون پر نظر ڈالو تو اس میں بھی یہ چیز نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر چیف سکریٹری یہ بولے کہ میں تمہاری بات نہیں مانوں گا اور وزیر اعلیٰ کہے کہ تمہیں ماننی پڑے گی تو پھر ایسے معاملہ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی ذمہ داری وزیر اعلیٰ کی ہوگی۔ البتہ پولیس فورس میں یہ میری ذمہ داری ہے۔

سوال: مسٹر چکرورتی نے بھی یہی بات کہی کہ بعض احکامات دیے تو گئے لیکن وہ بلاواسطہ طور سے نہیں دیے گئے تھے۔ یہ ایسی بات ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔

جواب: ہاں، ایسا ہے نا کہ وہ ایسے لوگوں ہی سے اس طرح کی باتیں کہتے ہیں جن کے اوپر ماضی میں انھوں نے کوئی احسان کیا ہوتا ہے۔ ان کو پتہ رہتا ہے کہ کون ان کی مدد کر پائے گا۔ غیر رسمی طور پر یہ انسپکٹروں اور نچلے درجے کے پولیس افسروں سے بات کرتے ہیں۔ لیکن سب افسران کے احکامات قبول نہیں کرتے۔ اس کے باوجود اعلیٰ درجے کے بعض افسر ایسے ہیں جن کا ضمیر اب بھی زندہ ہے۔

سوال: لہٰذا اگر وزیر اعلیٰ ان سے کہے گا تو اُلٹا بھی پڑ سکتا ہے؟

جواب: ہاں، جیسے کہ یہ شخص جن سے تم گاندھی نگر میں ملی ہو اشوک نارائن وہ کچھ بھی یوں ہی نہیں مان لے گا۔ نہ ہی 'جی سر، جی سر' کہے گا۔

سوال: بات یہ بھی ہے کہ وہ ایک آئی اے ایس افسر بھی ہیں؟

جواب: ہاں۔ وہ احکامات صرف کاغذوں پر لیتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کرتے ہیں۔

سوال: سر۔ آپ نے بھی ایک دل چسپ بات بتائی۔ مثلاً آپ نے کہا کہ انکاؤنٹر سے متعلق جاری تحقیقات کے دوران آپ کے اوپر سیاسی دباؤ ہوتا تھا تو کیا آپ ان لوگوں کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے جنھوں نے آپ پر دباؤ ڈالا تھا۔ مثال کے طور پر یہ وزیر داخلہ؟

جواب: اس کے لیے خاص شواہد درکار ہوتے ہیں۔ یہ وہ شواہد ہیں جو ہمارے خلاف جاتے ہیں۔ اس شاہ سے میں نے کہہ دیا تھا کہ بعض چیزیں تو میں نہیں کروں گا۔ لیکن وہاں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہیں گے کہ 'ہاں سر، ہم یہ کر دیں گے' کیوں کہ ان کے دوسرے مفاد ہوتے ہیں۔

سوال: اگر آپ سیدھے سیدھے وزیر داخلہ کے خلاف جاتے ہیں تو کیا ریاست آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتی؟

جواب: ایسا ہے کہ بلاواسطہ تو ایسا نہیں کر سکتا ہے البتہ بالواسطہ طریقہ سے تو وہ مجھے مروا بھی سکتا ہے۔ لیکن چوں کہ یہاں جمہوریت ہے اس لیے ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔

سوال: میں آپ کے بارے میں پڑھ رہی تھی، بظاہر آپ کے وزیر داخلہ امت شاہ کے خلاف الزام ہے کہ وہ متعلقہ افسروں سے گواہوں اور بیانات کی فراہمی کا مطالبہ کیا کرتا تھا؟

جواب: لیکن وہ اس کو کبھی نہیں ملے۔ بالواسطہ طور پر وہ پوچھا کرتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو میرے خلاف بول رہے ہیں؟

سوال: مسز جوہری کا کیا ہوا؟ اس نے تو کہا تھا کہ سہراب الدین ایک دہشت گرد تھا؟

جواب: دیکھو۔ بات سہراب الدین کی اتنی نہیں ہے جتنی کہ اس کی بیوی کی ہے۔ اگر سہراب الدین قانونی اعتبار سے صحیح طور پر کیے گئے انکاؤنٹر میں مارا گیا ہوتا تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ بات تھی اس کی بیوی کی، اس کو کیوں مارا گیا؟ اور وہ بھی تین دن بعد۔

سوال: تو آپ کیا اس معاملے کی تحقیقات کر رہے تھے؟

جواب: ہم نے تحقیقات تب کیں جب انکاؤنٹروں کے فرضی ہونے کی پوری کہانی سامنے آئی۔ لٰہذا گیتا نے یہ تحقیقات کیں۔ وہ میری ماتحتی میں کام کرتی تھی۔ جب تک میں وہاں تھا اس نے اچھا کام کیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی تم جانتی ہو (مسکراتے ہوئے)۔

سوال: اور اس لیے آپ کا تبادلہ کیا گیا؟

جواب: ہاں۔

سوال: درحقیقت میں پی سی پانڈے سے بھی ملی تھی؟

جواب: اوہ، وہ پولیس کمشنر ہوا کرتے تھے۔

سوال: کیا فسادات کے دوران آپ دونوں ساتھ میں کام کر رہے تھے؟

جواب: ہاں۔ ہمیں کرنا ہی تھا کیوں کہ میں آئی بی کا سربراہ تھا۔

سوال: بہت سے افسران جن سے میں مل چکی ہوں انھوں نے بتایا کہ پانڈے وزیر اعلیٰ کا راز دار ہوا کرتا تھا اور اسی کے ذریعہ فسادات میں سب کام مودی نے کروائے تھے؟

جواب: فسادات کے بارے میں اب تک سب کچھ تم جان ہی چکی ہو (مسکراتے ہوئے)

رائیگار نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ دراصل اس نے مزید کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ایک ایک لفظ جو اس نے ہم سے بتایا اس میں مودی، شاہ اور سازشی پولیس والوں کا ملوث ہونا بالکل واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ اندر ہی اندر میں اُبل رہی تھی۔ مائیک کو میرے غصے کا احساس ہو گیا تھا۔ جب ہم رائیگار کے گھر سے نکلے تو اس نے مجھے ڈھارس دینے کے لیے میرا ہاتھ تھام لیا۔ یہ تو ریاستی عملے کی ڈھٹائی تھی۔ گجرات فسادات اور فرضی انکاؤنٹروں کے معاملوں میں ریاست کی سازباز کے بارے میں رائیگار نے ریکارڈ سے پرے ہونے والی ساری باتوں کی تصدیق کر دی تھی۔

کیا رائیگار نے نتیجے کے طور پر یہ بات نہیں کہی تھی کہ آئی پی ایس افسر راہل شرما پر ریاست اس لیے ستم ڈھا رہی ہے کیوں کہ گجرات کے ایک مدرسے میں پڑھنے والے مسلم طلبا کی جانیں اس نے بچائی تھیں؟ کیا اب بھی ہم یہ مان سکتے ہیں کہ اس وقت کے گجرات کے وزیر اعلیٰ اور اس کے وزرا کے خلاف میڈیا بے جا ایذا رسانی کی مہم میں لگا ہوا تھا؟ ان ٹیپوں میں موجود ثبوت تو کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہے تھے۔

میرا سر دکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے گھر والوں کی بہت یاد آرہی تھی۔ مجھے میرے اپنوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے شدید خواہش ہو رہی تھی کہ میں اس نفرت سے دور چلی جاؤں جس کو اس بدقسمت ریاست میں بڑھاوا دیا جا رہا تھا اور جس کے بارے میں ہر روز کوئی نہ کوئی نئے انکشاف کرتا تھا۔ مجھے اب تھوڑا آرام چاہیے تھا۔

میں نے پانی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے ایک مقامی کاریگر سے کچھ سجاوٹی دستکاری کا سامان خریدا تھا اور انھیں اپنی دیوار پر آویزاں کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے

کہا 'ارے! میری مدد کرو۔' اور ایک دل آویز مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ پھر بتانے لگی کہ گجرات کتنا خوب صورت ہے۔ دبی زبان میں میں نے کہا: 'ہاں، ہاں واقعی۔ کاش کہ پانی وہ نفرت دیکھ سکتی جو میں دیکھ رہی تھی۔ گجرات کی نوجوان نسل کی طرح پانی بھی تو محض ۱۸ برس کی ہی تھی۔ ان میں اتنی نفرت کیوں بھری جارہی تھی؟ کچھ وقت کے لیے میں کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا میں نے اَجے کو فون کیا۔

ایک کالج میں جشن ہونے والا تھا جس کے دعوت نامے اس کے پاس موجود تھے۔ اَجے نے یہ پیشکش کی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لیتا جائے گا۔ میں نے کالا کرتا زیب تن کیا۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ میک اَپ کیا اور ہیل والی جوتی پہنی۔ مائیک جو قریب ہی بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا اس نے یہ کہہ کر ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ ایک دن کے لیے میں کالج کی طالبہ بن جاؤں۔ مستی میں باہر جاؤں اور ایک اچھی شام گزاروں۔ مجھے ایسی شام کی بہت ضرورت تھی۔ اسی شام مجھے محسوس ہوا کہ ایک شخص نہرو فاؤنڈیشن کے باہر کارپارک کر کے کھڑا ہے۔ اس شخص کو میں نے صبح بھی دیکھا تھا۔

یا شاید میرا یہ گمان تھا۔ جس کالج میں جشن تھا وہاں آٹو میں جانے کے بجائے میں نے اَجے کو میسیج کیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس شام میں نے تصویریں کھینچیں، طلبا کے ساتھ جم کر ناچا گایا اور خوب مستی کی۔ دوسرے دن وہ کار بھی غائب تھی جو گزشتہ روز باہر کھڑی نظر آئی تھی۔

☆☆☆

باب ہشتم

پی سی پانڈے

پولیس فورس کے بہت سے لوگ اسے شتر مرغ کہتے تھے۔ وہیں کچھ دوسرے لوگ اس کو نہایت بلند ہمت اور خوش اخلاق افسر کی حیثیت سے جانتے تھے جسے اپنی بات کہنے کا اچھا سلیقہ تھا اور تکلف پسند طبیعت کا حامل تھا۔ ایک ایسا شخص جس پر وزیر اعلیٰ کو بہت بھروسا تھا۔ جو ریاست کے تمام اہم معاملوں میں شاہ اور مودی کا ہم راز تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا جسے زندگی میں اچھی چیزیں پسند تھیں مثلاً بیرون ممالک میں چھٹیاں گزارنا، اپنے بارے میں شان دار تبصرے سننا اور شام کو کلب یا جم خانے میں دوستوں کے ساتھ شراب نوشی میں وقت بتانا۔

۲ مارچ ۲۰۰۲ء کے شمارے میں ٹیلیگراف اخبار نے اس کے بارے میں درج ذیل اوصاف بیان کیے تھے:

> احمد آباد کے سابق کمشنر آف پولیس شری پی سی پانڈے گجرات قتل عام کے دوران کمشنر آف پولیس ہوا کرتے تھے۔ پولیس کمشنر پی سی پانڈے سے بہتر کون پولیس کے کردار کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ تھا کہ پولیس عام سماجی ماحول سے الگ نہیں ہوتی۔ جب سماج کی سوچ میں بدلاؤ آتا ہے تو پولیس بھی اس بدلاؤ کا حصہ ہوتی ہے اور اس بدلاؤ کا متعدی اثر پولیس پر بھی پڑنا لازمی ہے۔

پہلے میں نے مائیک سے پانڈے کو فون کروایا۔ بعد میں لائحہ عمل جاننے کے لیے میں نے خود بھی اس کو فون کیا۔ اس کی بات سے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہم سے متاثر ہو چکا ہے۔ جب ہم احمد آباد میں واقع اس کے بنگلے میں داخل ہوئے تو وہ وہیل چیئر پر بیٹھی اپنی ماں کو باغ کی سیر کے لیے لے جا رہا تھا۔ میں نے پی سی پانڈے اور اس کی ماں کو 'نمستے' کیا۔ مائیک کا تعارف بطور اپنے معاون کے کروایا اور پھر ہمیں اندر لے جایا گیا۔ اس کی اہلیہ، جن کے بارے میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں اور زیر علاج ہیں، رہائشی کمرے میں داخل ہوئیں اور اپنا تعارف کروایا۔ کمرے میں اخبارات و رسائل کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ انڈیا ٹوڈے کا ایک شمارہ اور گجرات کے دیگر اخبارات کافی ٹیبل پر تھے۔

سب سے پہلے اس نے مجھ سے میرے نام 'تیاگی' کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں آر ایس ایس سے جڑی ہوئی ہوں اور میرے والد سنسکرت کے ٹیچر ہیں، پھر میں نے اپنی امریکی زندگی کی تفصیلات کا ذکر کیا۔ ان کو بتایا کہ میں کایستھ گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے خاندان کے لوگ ممبئی اور کانپور میں بسے ہوئے ہیں اور مذہب سے بہت دور ہیں۔ لیکن میں نے اس کو یقین دلایا کہ ملک میں مسلم نوازی کے ماحول کی وجہ سے میں اپنے مذہب سے قریب آنے لگی ہوں۔

اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ لیکن پانڈے ایک چالاک شخص تھا۔ وہ یہ جاننے کا خواہش مند تھا کہ ملاقات سے قبل میڈیا میں اس کی مشتبہ شخصیت کے بارے میں کسی نے ہمیں بتایا تو نہیں ہے۔ وہ بخوبی اپنے پینترے بدل رہا تھا۔ اس روز میں اپنا کوئی اوزار پہن کر نہیں آئی تھی۔ میں نے پُرجوش انداز میں کہا کہ میں نے فلم ساز نریش کنوڈیا، جو گجرات میں ہمارے واحد پہچان کے آدمی ہیں، سے آپ کے بارے میں صرف اچھی باتیں ہی سنی ہیں۔

'اوہ، اب سمجھ میں آیا۔' وہ خوشی سے اچھل پڑا، 'ورنہ آپ بھی الجزیرہ اور ملک کے دیگر سنسنی خیز صحافیوں کی طرح متعصبانہ ذہن کے ساتھ آتیں۔' میں نے اس سے کہا کہ مجھے

سورت کے ہیروں کے تاجروں سے ملنا ہے جو پوری دنیا میں بہت مشہور ہیں۔ میں اپنا ہوم ورک ٹھیک سے کر کے گئی تھی۔ پانڈے کا بیٹا سورت میں ہیرے کی تجارت کرتا تھا۔ اس نے خوشی خوشی مجھے اس سے رابطے کی تفصیلات دے دیں۔ میں نے پانڈے سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ مجھے کسی ایسے آدمی سے ملوانے میں مدد کرے جو 'درخشاں گجرات' کی تشہیر کے شعبے کو یا فلموں کے شعبے کو سنبھالتا ہو کیوں کہ 'درخشاں گجرات' کے بارے میں بڑی زبردست باتیں ہم نے سن رکھی ہیں۔ میں نے کہا: 'سر، مجھے کچھ، سفید ریت، نئی شاہراہ اور جدید ترین تکنالوجی کے بارے میں جاننا ہے جس کی وجہ سے گجرات بھارت کی سب سے ممتاز اور متحرک ترین ریاست ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کی تہذیب کے بارے میں بھی کچھ جاننا چاہتی ہوں۔'

فسادات کے دوران اس کی متنازعہ شبیہ کے بارے میں پانڈے کی تحریف کے باوجود میں نے اپنے رد عمل کا اظہار اس طرح کیا گویا یہ معاملہ میرے لیے دل چسپی کا باعث ہی نہ ہو۔ مجھے تھروپگرا نامی ایک شخص کا نمبر دیا گیا اور ہم سے بتایا گیا کہ یہ جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والا ایک نوکر شاہ ہے جو ہمیں گجرات سے متعلق تمام ضروری مواد فراہم کروائے گا۔ خاص طور سے 'درخشاں گجرات' کے بارے میں۔

خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے کہا کہ میتھلی تمہیں اخبار میں شائع نہایت قابل احترام دانشور سہیل سیٹھ کا یہ کالم ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس نے اچھی تیاری کر رکھی تھی۔ اس کے پاس ان تمام مضامین کے نسخے موجود تھے جن میں مودی کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے پاس انڈیا ٹوڈے کا وہ شمارہ بھی موجود تھا جس میں مودی کی تعریف میں دیوبند کے مولانا وستانوی کا بیان چھپا تھا، یہ وہی بیان ہے جس کے بارے میں وستانوی نے بعد میں کہا تھا کہ اس کو غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ پانڈے کے پاس سہیل سیٹھ کے کالم کے کم از کم بارہ نسخے موجود تھے۔ جس میں سے ایک نسخہ اس نے مجھے بھی دیا۔ پانڈے نے مزید کہا کہ اگر فلم

امریکہ کے گجراتیوں کے لیے بنائی جارہی ہے تو مجھے پورا یقین ہے کہ مودی جی کو تم سے بات کر کے خوشی ہو گی۔ مجھے بتانا میں ان سے ملاقات طے کرادوں گا۔

میں نے کسی جوش وخروش کا اظہار نہیں کیا۔ بس اتنا کہا کہ ہر وہ شخص جس سے پانڈے ملنے کو کہے گا میں اس سے مل لوں گی کیوں کہ وہ گجرات کے سب سے ہنرمند آدمی لگتے ہیں اور فلم سازی کے بارے میں مجھے ان کی رہنمائی کی ضرورت ہو گی۔ یہ سن کر پانڈے کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

بعد میں کینٹین میں بیس روپے والا کھانا کھاتے وقت میں نے مائیک سے کہا کہ ہمارا سابقہ پیادوں سے نہیں پڑا ہے۔ اپنی پلیٹ میں پڑا فرائی پاپڑ میں نے مائیک کو دے دیا جو اسے بہت پسند تھا۔ پھر میں نے مائیک سے بتایا کہ تہلکہ میں کام کرنے والے میرے ایک رفیق کار نے ماضی میں گجرات میں ایک خفیہ تفتیش کی تھی لیکن وہ خفیہ تفتیش ٹھگوں اور فسادیوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن ہمارا سابقہ ذہین اور ہوشیار لوگوں سے پڑ رہا ہے اس لیے جو حد طے کی گئی ہے اس کے بارے میں بے حد پُراعتماد اور مطمئن رہنے کی ضرورت ہے۔ مائیک نے چٹکی لیتے ہوئے کہا کہ خفیہ تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہم ایک فلم کا مسودہ لکھیں گے۔ اس بات پر ہم ہنس پڑے۔

جب پی سی پانڈے سے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا اسی دوران رائیگار، اشوک نارائن اور مایا کوڈنانی کے ساتھ بھی ہم ملاقات کر رہے تھے۔ اور ہم نے سب کو بتادیا تھا کہ ہم دوسرے لوگوں سے بھی مل رہے ہیں۔ ایک روز جب میں پی سی پانڈے سے ملاقات کے لیے اس کے بنگلے پر جارہی تھی تو میں بال بال بچ گئی۔ کیوں کہ جوں ہی میں اس کے گھر کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ایک افسر کا اردلی جو مجھے رعنا ایوب کے طور پر جانتا تھا پانڈے کے گھر سے صرف تین گھر دور ایک بنگلے سے باہر آرہا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میرے گھنگھریالے بال جس کی وجہ سے میں آسانی سے پہچان لی جاتی ہوں اس روز ٹھیک سے بندھے

ہوئے تھے اور رومال سے تقریباً میرا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ میرا استقبال کرنے کے لیے پانڈے دروازہ پر موجود تھا۔ پسینے کے قطرے میری پیشانی پر ظاہر ہو رہے تھے اور لڑھکتے ہوئے میرے رخسار تک پہنچ گئے۔ میرے جسم کی حرارت بڑھ گئی تھی۔ پانڈے کو اندازہ ہو گیا کہ مجھے پسینہ آرہا ہے اور میرے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ بنگلے میں داخل ہوتے وقت اس نے پوچھا: 'میتھلی، تم ٹھیک تو ہو؟' میں نے جواب دیا: 'ہاں سر، میں ٹھیک ہوں۔' لیکن اس خوف سے میں ابھی بھی باہر نہیں آپائی تھی کہ ایک منٹ پہلے میرا پردہ تقریباً فاش ہو چکا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا کہ شاید موسم کے بدلاؤ کی وجہ سے مجھے بخار ہو گیا ہے۔

پانڈے نے فوراً مجھے بٹھایا۔ اپنی خادمہ سے میرے لیے ایک کپ کافی بنانے کو کہا اور خود اپنے کمرے میں جاکر میڈیکل کٹ لے آیا۔ اس نے تھرمامیٹر مجھے اپنی زبان کے نیچے دبانے کو کہا۔ میں کانپ رہی تھی۔ اس نے مجھے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ عام بات ہے۔ تھرمامیٹر ۹۹ ڈگری بخار دکھا رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک بسکٹ دیا۔ اس کے بعد کافی پیش کی اور پھر اصرار کر کے بخار کم کرنے والی دوا کھلائی۔ اب میں بہتر محسوس کر رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر مسز پانڈے کے بارے میں دریافت کیا جو چند منٹوں کے بعد ہی اندر آگئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد پانڈے نے اپنے بھائی کے ساتھ فون پر گفتگو کی، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے رشتے داروں یا کسی اور کے ساتھ نیپال جانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس اپنے کام کے لیے وقت بہت کم بچا ہے۔ وہ سال کے آخر کے وقفے کے دوران کاٹھمنڈو کی زیارت کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ملک کے بعض اچھے مقامات کے بارے میں بتایا اور مشورہ دیا کہ نئے سال کی شام میں ان کو ضرور دیکھوں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک دن ہم گجرات میں ہندو مسلم تفریق پر بحث کر رہے تھے تو پانڈے نے بتایا کہ اس کا ایک مسلمان دوست ہے، جو وکیل ہے اور اکثر اس کے گھر آتا رہتا ہے۔ اس دن کے بعد سے

جب بھی میں پانڈے کے گھر بیٹھتی تو مجھے تشویش ہونے لگتی کیوں کہ احمد آباد کے اس وکیل سے میں واقف تھی۔ اس سے میری ملاقات کئی ایسے تعزیری مقدموں کے سلسلے میں ہو چکی تھی جن کی وہ پیروی کر رہا تھا۔ میرے اعصاب میں ہلچل مچی ہوئی تھی پھر بھی آئندہ مہینوں میں پی سی پانڈے کے ساتھ گفتگو آسانی سے چلتی رہی۔

سوال: آر ایس ایس کے لیے گجرات کتنا اہم ہے؟

جواب: تم یہ دیکھو کہ بی جے پی والی گجرات سرکار کے لیے یہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ واحد ایسی تنظیم ہے جو اسلامی پارٹیوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

سوال: اور وہ آر ایس ایس کے کتنا قریب ہے؟

جواب: اوہ ہاں۔ وہ آر ایس ایس کے نہایت قریب ہے۔ یہ تنظیم اس کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اس کا کارکن تھا۔ یہاں کا آر ایس ایس سربراہ امرت بھائی کادی والا کا مودی پر بڑا اثر و رسوخ ہے۔

سوال: میں آپ کے وزرا کے بارے میں بہت پر شکایت بھری باتیں سنتی ہوں خواہ فسادات کو لے کر ہو یا موجودہ صورت حال کے متعلق، کیا ہرین پانڈیا یہاں کی آر ایس ایس تنظیم کا بہت عزیز تھا؟

جواب: ہاں، وہ یہاں کا بہت مقبول لیڈر تھا۔ وزیر داخلہ ہرین پانڈیا آر ایس ایس کے بہت قریب تھا۔ اسی کی وجہ سے امت شاہ یہاں ہمارے پاس تھا، آج کل امت شاہ سلاخوں کے پیچھے ہے۔ وہ بھی آر ایس ایس کے بہت قریب تھا۔ ایک دوسرا لیڈر گووردھن زدافیا یہاں ہوا کرتا تھا، بیچ میں وہ وی ایچ پی کے بہت قریب ہو گیا تھا۔

سوال: اور سب کے سب وزرائے داخلہ تھے؟ کیا یہ ایک سوچا سمجھا فیصلہ تھا کہ ان کو وزارت داخلہ میں ہی رکھا جائے؟

جواب: ہاں۔ کیوں کہ داخلہ ڈپارٹمنٹ پولیس افسروں کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس لیے اپنے

لوگوں کو رکھنا اچھا ہوتا ہے۔ کیشو بھائی جب وزیر اعلیٰ تھے تب بھی ہرین پانڈیا وزیر داخلہ ہوا کرتا تھا۔

سوال: کیا مجھے گوردھن زدافیا سے ملنا چاہیے؟ آپ کیا مشورہ دیں گے؟

جواب: نہیں۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ تمہیں اس سے ملنا چاہیے کیوں کہ اگر تم ایسا کروگی تو راستے سے بھٹک جاؤگی۔ میرا مطلب ہے کہ یہ تمہاری فلم کا حصہ نہیں ہے۔

سوال: اچھا تو اگر میں دہلی میں رہوں تو کیا مجھے امت شاہ سے ملنا چاہیے۔

جواب: ہاں۔ تمہیں ملنا چاہیے۔ وہ ایک نظریہ ساز شخص ہے۔

سوال: آپ اس سے ملنے کا مشورہ کیوں دے رہے ہیں؟

جواب: تمہیں ریاست کے بارے میں ایک مختلف تناظر مل جائے گا۔ کیوں کہ وہ اپنی پوری توجہ اپنے مقصد پر رکھنے والا شخص ہے۔ وہ آر ایس ایس اور ریاست کے بارے میں بتائے گا۔

سوال: کیا میں اس سے آپ کا حوالہ دے کر مل سکتی ہوں؟ وہ کہاں مقیم ہے؟

جواب: ہاں۔ اس سے کہنا کہ میں نے کہا ہے۔ وہ گجرات بھون میں ٹھہرتا ہے۔

سوال: کیا مودی جی سے میں فسادات کے بارے میں بات کروں؟

جواب: مت کرو، وہ بولے گا ہی نہیں۔

سوال: یہ اس کی دکھتی رگ جیسا معاملہ ہے؟

جواب: ہاں۔ مت بولنا۔

سوال: تو کیا آپ فسادات کے دوران موجود تھے؟

جواب: ہاں۔ یہ میری زندگی کا سب سے بھیانک دور تھا۔ میں اپنی ملازمت کے تیس سال دیکھ چکا ہوں۔ لیکن دیکھو فسادات تو ۸۵ء، ۸۷ء، ۸۹ء اور ۹۲ء میں بھی ہوئے اور زیادہ تر موقعوں پر ہندوؤں کی پٹائی ہوئی اور مسلمانوں کو برتری ملی۔ لہٰذا اس بار

۲۰۰۲ء میں یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ ہندوؤں کا انتقام تھا۔ مزید یہ کہ ۱۹۹۵ء کے بعد لوگوں کو پہلی بار محسوس ہوا کہ سرکار ان کی اپنی ہے، خاص طور پر اس لیے کہ بی جے پی کی سرکار تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں لوگوں تک نہیں پہنچا۔ لیکن کیا ایک آدمی نے بھی مجھے بلایا؟ میں کوئی غیب کا علم رکھنے والا شخص تو ہوں نہیں کہ مجھے پتہ چل جائے کہ کون مجھے بلا رہا ہے۔

سوال: یعنی کہ مودی پوسٹر بوائے ہے؟

جواب: تم رقاصہ ملیکا سارہ بھائی کو تو جانتی ہو، وہ مودی کی بہت بڑی ناقد ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ۲۰۰۲ء کے فسادات اسی کی وجہ سے ہوئے۔ مودی کہتا ہے کہ گودھرا جاکر میں نے ٹرین کو نہیں جلایا۔ اور اگر میں نے ٹرین نہیں جلائی تو پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے لیے تم مجھے کیوں موردالزام ٹھہرا رہے ہو۔ اگر وہ میں نے کیا ہوتا تو یہ بھی میں نے ہی کیا ہوتا۔ دیکھو، جو کچھ وہاں ہوا یہ اس کا ردعمل تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر منطقی طریقہ سے تم اس کو دیکھو تو ایک مسلم گروپ ہے جو جاکر ٹرین کو آگ لگا دیتا ہے تو پھر تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟

سوال: واپس تم بھی اس پر حملہ کرو؟

جواب: ہاں، ہاں۔ تم بھی اس پر جوابی حملہ کرو، اب جوابی حملہ ہوا ہے۔ اگر تم نے تحقیقات کی ہوں گی تو معلوم ہوا ہوگا کہ ۸۵ء، ۸۶ء اور ۹۲ء وغیرہ میں ہندوؤں کو مار پڑی تھی۔ اب یہاں ایک موقع ملا مسلمانوں کو مارنے کا۔ تو پھر کسی کو بُرا کیوں لگ رہا ہے۔

سوال: اور مجھے یقین ہے کہ اس نے اس کو روکا نہیں ہوگا؟

جواب: دیکھو، لوگ جب ایک بار اس طرح کے معاملے میں جذباتی ہو جاتے ہیں تو پھر ان کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مصر میں ہوا۔ تم مجھے بتاؤ کیا اس طرح کی آبادی پر تم گولیاں چلانا چاہو گی؟

اور اگر وہ ایسا کرتا ہے تو کیا ہو گا؟ کیا اس شخص کو گلیوں میں دوبارہ چلنے کی اجازت ملے گی؟ اب جب اس طرح کا منظر نامہ ہو تو تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ مودی کو اسے بند کرنا چاہیے تھا؟ جب کہ ریموٹ اس کے ہاتھوں میں تھا ہی نہیں۔

سوال: کتنے دنوں تک فسادات جاری رہے؟

جواب: شروعاتی دور میں تقریباً دو دنوں تک ہی چلا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔

سوال: تو کیا ہندو، مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے تھے؟ میڈیا نے تو اس کو اسی طرح سے پیش کیا ہے؟

جواب: ہاں۔ وہ اور کیا دکھائیں گے؟ مسلمان بھی ہندوؤں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ تم تقابلی طور پر تو دیکھو اگر فیصدی اعتبار سے نہ دیکھنا چاہو۔ لیکن ہم یہاں برابری کا موازنہ نہیں کر رہے ہیں۔ یا برابر طریقہ سے متوازن نہیں بنا رہے ہیں۔ لیکن پھر بات یہ آتی ہے کہ تشدد پر اترنے والے پہلے مسلمان تھے، انھوں نے گودھرا میں ٹرین کو جلایا تھا۔ لہٰذا فطری بات ہے کہ اس کا ردعمل ہو گا۔

مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا تھا لیکن انھوں نے بھی پلٹ وار کیا۔ لہٰذا اگر ایک ہندو بھی ان کے راستے میں آیا تو وہ مارا گیا۔ اس کے بارے میں تم اس سے پوچھو۔ تو وہ بتائے گا۔

سوال: ویسے میں نے ایس آئی ٹی رپورٹ پر ایک مضمون گزشتہ کل کے اخبار میں دیکھا ہے۔

جواب: ارے ہاں۔ فسادات کی تحقیقات کے لیے ایک ایس آئی ٹی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ وہ اسی کے بارے میں ہو گی۔ رپورٹ سپریم کورٹ میں جمع کر دی گئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ میڈیا کو خفیہ طریقے سے دے دیا گیا ہے۔ اسی اخبار کو، ورنہ یہ رپورٹ خفیہ تھی۔ ویسے رپورٹ نے کسی معاملے میں اس کا نام نہیں لیا ہے۔

لیکن جس آدمی نے اس رپورٹ کو لکھا ہے اس کا کہنا ہے کہ اُسے کچھ بھی ایسا نہیں ملا جس کی وجہ سے اس کو موردالزام ٹھہرایا جائے۔

سوال: کیا انھوں نے آپ کو موردالزام ٹھہرانے کی کوشش نہیں کی؟

جواب: ہاں کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جن افسران نے اس کے لیے کام کیا تھا ان کو سبکدوشی کے بعد بھی عہدوں سے نوازا گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کون سا عہدہ؟ میرا عہدہ ایسا ہے جس کے عوض کوئی پیسہ نہیں ملتا ہے۔

سوال: لیکن بات یہ بھی ہے کہ اگر آپ ریاست کے لیے کام کر رہے ہیں تو وہ آپ کو کیوں نہیں نوازے گا؟ کیا یہ نوازش ان پر ہوگی جو اس کے خلاف گئے تھے؟

جواب: ہاں، وہ عہدے ان لوگوں کو کیوں دے گا جو اس کے خلاف گئے تھے؟

سوال: بالکل نہیں۔

جواب: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی سوال ہی نہیں۔

سوال: وہ کوئی سادھو سنت تو ہے نہیں؟

جواب: یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔

سوال: آپ سڑک پر چلے جائیں، لوگوں سے پوچھیں، پریمل گارڈن تک چلے جائیں؟

جواب: ہاں سب اس سے محبت کرتے ہیں۔

سوال: میرا خیال ہے کہ اس لیے بھی وہ محبت کرتے ہیں کیوں اس نے لوگوں کو وہ چیز دی جو وہ چاہتے تھے۔ لوگ جو چاہتے وہ اس کی مجسم مثال ہے۔ اکثر لوگوں نے کہا ہے کہ اقلیت نوازی بند ہوئی اور اس طرح ہندوؤں کو ان کا وقار واپس مل گیا۔

جواب: ہاں، یہ وہ فیڈ بیک ہے جو مطلوب ہے۔

سوال: تو کیا مسلمان اس سے نفرت کرتے ہیں؟

جواب: بس وہی جو کٹر ہیں۔ لیکن میڈیا میں جو کچھ چل رہا ہے وہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جیسے

کہ تم نے دیوبند کے سربراہ وستانوی کو دیکھا ہوگا جس کے بارے میں انڈیا ٹوڈے میں آیا ہے۔ جب وستانوی نے کہا کہ گجرات مساوی مواقع فراہم کرتا ہے۔ تو اس پر اعتراض ہو گیا۔ کیوں کہ انھوں نے سوچا کہ ۲۰۰۲ء میں اس نے جو کچھ کیا اس کے لیے مودی کو وستانوی سرٹیفکیٹ دے رہا ہے۔

سوال: میں (مِکل) سنہا کے گھر پر بیٹھی تھی، وہاں الجزیرہ چینل کے کچھ رپورٹروں سے ملاقات ہوئی؟

جواب: اوہ، ہاں۔ مسلم چینل والے لوگ گودھرا فیصلہ کو کور کرنے کے لیے آئے ہوں گے، اب کچھ نہ کچھ بے تکی باتیں کہیں گے ہی۔

سوال: انھوں نے دراصل مجھے کسی میگزین کا ایک نسخہ دیا ہے جس میں ایس آئی ٹی کے اوپر ایک رپورٹ چھپی ہے۔

جواب: اچھا، یہ میگزین کمیونلزم کمبیٹ رہی ہوگی۔

سوال: نہیں نہیں۔ ابھی بتاتی ہوں آپ کو۔۔۔ اس رسالے کا نام تہلکہ ہے۔

جواب: اوہ، سنسنی خیز صحافت کی وہ ایک کلاسیکی مثال ہے۔ تمہیں پتہ ہے تہلکہ والے کیا کرتے ہیں؟ وہ اپنے ساتھ کیمرے لے کر چلتے ہیں تاکہ تمہاری تصویر نکال سکیں۔ وہ دکھائیں گے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو پیسہ دے رہا ہے۔ پہلے وہ اس طرح کا کام کریں گے اور پھر اس کے بارے میں باتیں کریں گے، اب گفتگو تو تم سنتے نہیں ہو یہ تصویریں صرف دکھائی جاتی رہتی ہیں۔

سوال: وہ اس کو کیسے دکھاتے ہیں؟

جواب: وہ لوگ اس کو چینلوں کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔ اس سے پہلے انھوں نے کسی وزیر کو ہتھیاروں کے تاجر کے ساتھ پیسے کی لین دین کرتے ہوئے دکھایا تھا۔ الگ الگ

ٹکڑوں میں ہو گا کبھی بھی مکمل فوٹیج نہیں ہو گا۔ وہ فوٹیج کو اخبار کے چینلوں کے معرفت بیچ دیتے ہیں۔ جیسے کہ وہ سنہا، اسے الجزیرہ کو انٹرویو دینے کی کیا پڑی تھی۔ وہ چینل لگاتار دکھاتا رہا کہ کس طرح سے عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور ان کو زندہ جلا دیا گیا اور یہ سب کس لیے؟ صرف اس لیے کہ اس سے زیادہ فائدہ ملتا ہے۔

سوال: کمیشنوں نے تو آپ سے بہت پوچھ تاچھ کی ہو گی؟

جواب: ہاں۔ میں اب بھی اس سے گزر رہا ہوں۔

سوال: اس کا مطلب یہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے؟ آپ سے سوالات تو ضرور پوچھے گئے ہوں گے؟

جواب: ہاں۔ مجھ سے سوالات پوچھے گئے تھے۔ اب بھی چل ہی رہا ہے کیوں کہ اس ڈنڈے سے تم نریندر مودی کو پیٹ سکتے ہو۔ ان کے لیے ۲۰۰۲ء ایک ہمہ وقتی پیشہ ہے۔ کیوں کہ اس سے پیسہ بہت ملتا ہے۔

سوال: میں واقعی جاننا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ بطور پولیس کمشنر وہاں موجود تھے تو آپ نے کس طرح سے اس کو سنبھالا تھا؟

جواب: یہ بڑا ہی خوف ناک منظر تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کے حالات میں نے نہیں دیکھے تھے لیکن یہ بالکل الگ قسم کا تھا۔ اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ مصر میں ہوا۔ تمہیں پتہ ہے کہ مصر میں لوگوں پر قوت کا استعمال تم نہیں کر سکتے، ٹھیک ہے نا، تو پھر کوئی اس جیسی بھیڑ پر قوت کا استعمال کیسے کر سکتا ہے جو احتجاج کرنے کے لیے باہر نکلی ہوئی تھی۔ کیا وہ اس کے بعد اپنا وجود باقی رکھنے کے قابل رہ سکتا تھا؟ قوت کا استعمال اس کا جواب نہیں ہے۔

سوال: تو کیا گودھرا واقعہ ہی گجرات فساد کا سبب بنا؟

جواب: ہاں۔ ایودھیا سے ایک ٹرین آ رہی تھی جس میں وی ایچ پی والے سفر کر رہے تھے۔

اس میں وی ایچ پی کے لوگ تھے، وہ ایودھیا میں مندر کی تعمیر کے خواہش مند تھے۔ وہی لوگ واپس آرہے تھے۔ کل ۳۷ افراد تھے لیکن کچھ مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ مقامی لوگ پٹرول کے ڈبے لے کر آئے، کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور آگ لگادی۔ نتیجتاً ۶۱ لوگ مر گئے۔

اس کے انتقام میں وی ایچ پی نے بند کا اعلان کر دیا۔ پھر ۲۸ تاریخ کو تشدد بھڑک اُٹھااور ہر کوئی سڑکوں پر اتر آیا۔ بوڑھے، جوان، لڑکیاں۔۔۔

سوال: تو اس کے خلاف الزام کیا ہے؟

جواب: ان کا نظریہ ہے کہ اسی نے ہر آدمی کو باہر آنے کے لیے منظم کیا۔ ۲۷ تاریخ کو وہ گودھرا گیا تھا۔

الزام یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف تشدد کے لیے اسی نے اکسایا تھا۔

سوال: الزام یہ بھی ہے کہ وہ گودھرا گیا لیکن فسادات سے متاثرین لوگوں کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

جواب: وہ یہ کیوں کرے گا۔ ان سے کیوں ملے گا؟

سوال: ہاں۔ ہندو مارے جارہے تھے؟

جواب: اور وہ دس یا گیارہ بجے رات کو واپس لوٹا تھا۔

سوال: ان کا ماننا ہے کہ اس نے انھیں کسی طرح کی کارروائی کرنے سے منع کیا تھا؟

جواب: ہاں، اسی لیے انھوں نے کمیشن کے دوران مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور میں نے وضاحت کر دی کہ مجھے اس طرح کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس طرح کا کوئی حکم اس کی جانب سے مجھے نہیں ملا اور میں نے کارروائی بھی کی تھی۔

لیکن اس کے باوجود لوگ مارے گئے۔

اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ہر آدمی کی حفاظت میں کر سکتا ہوں۔

تمام مسلمان ہوں

میں خدا نہیں ہوں اور جیسا کہ میں نے کہا کہ بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں نے کی تھی۔

سوال: کیا صرف یہی ایک بات ہے؟

جواب: نہیں، لیکن میرے خلاف ان کے پاس بس یہی ایک چیز ہے کیوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ نریندر مودی تک پہنچ سکتے ہیں۔ جو میرے ذریعے ہو سکتا ہے۔

سوال: اور اس لیے بھی کہ آپ اس سے بہت قریب ہیں۔

جواب: وہ چاہتے ہیں کہ میں اس کے خلاف کچھ کہوں۔ تب جا کر وہ خوش ہوں گے۔

سوال: تب تو آپ نے اپنے لیے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہوں گے۔ خود فورس میں بھی؟

جواب: دو چار آئی پی ایس افسر ہو سکتے ہیں۔

سوال: جیسے کہ وہ مٹھی بھر لوگ جن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں اچھا کام کر رہے تھے؟

جواب: ہاں۔ یہ راہل شرما، ستیش ورما، کلدیپ شرما یہی وہ لوگ ہیں۔

سوال: ہاں۔ہاں۔

جواب: وہ کلدیپ شرما ہے نا اس کو بھیڑ اور اون ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا ہے۔ وہ آج کل سرکار کی نظر میں اچھا آدمی نہیں ہے لیکن مکل سنہا جیسے لوگوں کی نظر میں اچھا ہے۔

دیکھو یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تمہیں پوری بات جاننے کی ضرورت پڑے گی۔ کلدیپ شرما نے اس وقت کے وزیر داخلہ کے ساتھ پنگا لے لیا تھا۔

سوال: اور کون تھا وہ؟

جواب: امت شاہ

سوال: وہی آدمی جو گرفتار ہوا تھا؟

جواب: کلدیپ شرما نے وزیر اعلیٰ سے شکایت کی کہ تمہارا وزیر داخلہ حد سے گزرا ہوا بدمعاش آدمی ہے، تو وزیر اعلیٰ نے کہہ دیا ہوگا کہ اس بات کو ثابت کرو۔

سوال: لیکن وہ وزیر داخلہ کے خلاف کیسے کارروائی کرے گا؟

جواب: اور سنو۔ پھر اس نے یہ ہمت دکھائی کہ وزیر اعلیٰ کو خط لکھا کہ اس معاملہ میں وزیر داخلہ کے خلاف سی بی آئی سے انکوائری کروائے۔ لیکن وزیر اعلیٰ نے کہا کہ میں اس کی انکوائری کسی سبکدوش چیف سکریٹری سے کرواؤں گا۔

سوال: تب تو شاہ کی گرفتاری سے کلدیپ شرما خوش ہوا ہوگا؟

جواب: اس کو گرفتار کروانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

سوال: لیکن کیسے؟

جواب: اسی نے سی بی آئی اور میڈیا کو ثبوت فراہم کرایا تھا پانڈیان نامی ایک افسر کے فون کال ریکارڈ کو ثابت کر کے۔

سوال: کیسے؟

جواب: پانڈیان اور کلدیپ کے کچھ معاملے ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ پانڈیان نے میڈیا میں ایک معاملے کا انکشاف کر دیا۔ اس لیے کلدیپ پانڈیان کو جیل بھیجنا چاہتا تھا۔ اور پانڈیان صحیح معنی میں انکاؤنٹر میں ملوث تھا۔

سوال: اوہ۔ تو اس طرح وہ وزیر داخلہ تک پہنچا؟

جواب: ہاں، کیوں کہ پانڈیان وزیر داخلہ کا قریبی تھا۔ وہ اس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ لہٰذا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ شاہ انکاؤنٹر میں ملوث تھا۔

سوال: تو آخر یہ کون لوگ ہیں جس کا انکاؤنٹر کیا گیا تھا؟

جواب: سب کے سب لفنگے اور معمولی مجرم تھے۔ جب قانون کچھ نہیں کرتا تو آپ کو انھیں

راستے سے ہٹانا پڑتا ہے۔

سوال: میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کسی عورت کا انکاؤنٹر بھی کر دیا گیا تھا، اس کو دہشت گرد بتا کر؟

جواب: ہاں۔ہاں۔

میں جو بات کہہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ میں ڈی جی تھا اور فورس سے سبکدوش ہو رہا تھا۔ تب تک کلدیپ شرما بھی بیرون ملک سے واپس لوٹ آیا تھا۔ اور وہ ڈائرکٹر جنرل آف پولیس بننا چاہتا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم ایسے شخص کی تقرری اس قسم کے عہدہ پر کیسے کروگے ؟جو سرکار کے خلاف ہمیشہ کسی نہ کسی شرارت میں لگا رہتا ہے۔

سوال: ہاں۔اور وہ تو سرکار کے خلاف جا بھی چکا تھا پھر وہ ایسا کیسے کر سکتے تھے؟

جواب: ہاں، ان سے تم یہ امید تو نہیں رکھ سکتے نا کہ وہ اس جیسے آدمی (کلدیپ شرما) کی تقرری کریں گے۔ لہٰذا اس کو سائڈ پوسٹنگ دی گئی۔

سوال: کس طرح سے؟

جواب: اس کو بھیڑ اور اون ڈپارٹمنٹ کا چیف بنا دیا گیا (ہنستے ہوئے)۔

سوال: اوہ۔۔۔۔یہ تقرری تو سزا کے مانند ہوئی!

جواب: یہ تقرری ایک سزا بھی تھی۔ اس تقرری کا مقصد ہی سزا دینا تھا۔ اگر تم سرکار کے خلاف جاتے ہو تو پھر میرا مطلب ہے کہ۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ ڈائرکٹر جنرل بننے کے لیے سب سے لائق شخص تھا۔

اس نے پولیس نظام اور اصلاحات کے موضوع پر پی ایچ ڈی بھی کی تھی لیکن وہ بس انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہیں سے آغاز ہوا۔

وزیر اعلیٰ ہمیشہ کہتا تھا کہ وہ نہایت ناقابل اعتبار شخص ہے۔ درحقیقت وزیر داخلہ کے ساتھ اس کا رشتہ بہت اچھا تھا۔

سوال: لیکن وزیر داخلہ تو ایک خاص ہی کیریکٹر ہے؟

جواب: لیکن تمہارے لیے میرا مشورہ یہی ہو گا کہ تم اس سے ملو، وہ ضمانت پر ہے، گجرات میں داخل نہ ہونے کی شرط پر ہی اس کو ضمانت ملی ہے۔ اس لیے میں تم کو مشورہ دوں گا کہ اس سے تم ملو۔ وہ بڑا ہی ذہین آدمی ہے۔ بہت سی دل چسپ باتیں بتائے گا۔

سوال: ایک نظریہ بردار شخص؟

جواب: ہاں۔ وہ پکا آر ایس ایس کا آدمی ہے۔

سوال: تو پھر اس کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

جواب: کیوں کہ تیستا اور سنہا جیسے لوگوں کو یہ بات پسند ہے۔

دیکھو، تم جو بھی کہو لیکن ۸۰ فیصد عوام کا تعلق اکثریت طبقے سے ہے۔ وہ ہندو ہیں۔ اس لیے تمہیں ان کا خیال رکھنا ہو گا۔ جیسے کہ کانگریس پارٹی کرتی ہے۔ اور تمہیں مسلمانوں کے ناجائز کرتوتوں کو بڑھاوا کیوں دینا پڑتا ہے؟ مسلمان چاہے جتنا غلط کریں تم ان کی حمایت کرنا چاہتے ہو۔ ہندو چاہے جتنا اچھا کریں تم ان کے خلاف جاتے ہو؟

سوال: لیکن ہندوؤں کو تو بڑی راحت محسوس ہوئی ہو گی؟

جواب: ہاں، ہاں۔ اب ذرا جا کر شہر میں چکر لگالو اور شہر میں ہندو اور مسلمان غلبہ والے علاقہ میں گھوم کر دیکھو۔ ڈھیروں ریکارڈوں کو ہمیں کھنگالنا پڑا تب جا کر انڈین مجاہدین والے لڑکے پکڑے گئے (گجرات دھماکے)۔

سوال: واہ۔

جواب: اور سپریم کورٹ کا کہنا ہے کہ ان کے مقدمے مت چلاؤ۔

سوال: کیوں؟

جواب: اقلیت نوازی

سوال: کیا سپریم کورٹ میں بھی ایسا ہوتا ہے؟

جواب: ہاں، ہوتا ہے۔

ان لوگوں کو تو دیوار کے سہارے کھڑا کر کے گولی ماردینی چاہیے۔ تمہیں پتہ ہے ایک دھماکہ ہوتا ہے۔ اس میں چھ لوگ مارے جاتے ہیں اور پھر دوسرا دھماکہ ہوتا ہے۔ تیسرا دھماکہ اسپتال کے ٹراما سینٹر کے پاس ہوتا ہے اور وہیں پر مریض آتے ہیں۔ لہٰذا میں نے وزیر اعلیٰ کو فون کر کے کہا کہ آپ وہاں نہ جائیں، تب تک وہ کمشنر کے دفتر تک پہنچ چکا تھا۔ بم ایک گاڑی میں رکھا گیا تھا۔ ان چیزوں کی پیچیدگی کو تم دیکھو، اور پھر بھی تم ان کو خوش کرنا چاہتے ہو۔ کس لیے؟ ووٹوں کی خاطر۔

میرا سب سے اچھا دوست ایک مسلمان ہے لیکن وہ ایک الگ بات ہے۔ وہ بس ایک فرد ہے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جو ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے کوئی دقت نہیں ہے۔

سوال: مجھے خوشی ہوئی کہ فسادات کے دوران مسلمانوں کو سبق سکھایا گیا؟

جواب: ہاں، تم ایسا محسوس کرتے ہو۔ بعض اوقات لگتا ہے جو ہوا ٹھیک ہوا۔

اس لیے میں بہت خوش ہوں کہ میں ان لوگوں (مسلم) کو سلاخوں کے پیچھے کرا سکا یہ میرے لیے سب سے سکون بخش بات ہے۔

البتہ مکل سنہا اور تیستا جیسے لوگ کہیں گے کہ یہاں انارکی ہے۔

ہاں! یہاں انارکی ہے لیکن اس انارکی کو پیدا کس نے کیا؟ انہی مسلمانوں نے اور ایسا نہیں ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے تئیں مجھے بڑا لگاؤ ہے۔ لیکن اگر کانگریس ایسی ہی ہے تو پھر میں بھی بی جے پی کے ساتھ ہی رہوں گا۔

سوال: انکاؤنٹر کے بارے میں آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: دیکھو۔ ذاتی طور پر میں انکاؤنٹر کے خلاف ہوں، یہ بالکل قتل کے ارتکاب جیسا کام ہے، لیکن کبھی کبھی یہ ضروری ہو جاتا ہے۔

سوال: ہاں۔ اسی لیے اس افسر نے جس سے میں نے بات کی تھی اس انکاؤنٹر کے بارے میں مجھے بتا رہا تھا۔

جواب: اچھا، تب تو میرا نام بھی ضرور آیا ہو گا۔ میں ڈائرکٹر جنرل تھا۔ لیکن انکاؤنٹر کے دوران نہیں۔ انکاؤنٹر ۲۰۰۵ء میں ہوا تھا۔ البتہ معاملہ کی تحقیقات کے لیے مجھے کہا گیا تھا۔

سوال: اوہ، اوکے۔

جواب: اس آدمی سہراب الدین کو کچھ اے کے (رکھنے) کے الزام میں سزا دی جا رہی تھی۔ برآمدگی ہوئی اور پھر بعد میں (اس کو) سزا ملی۔ یہ اس کا پس منظر ہے وہ لڑکی (کوثر بی) اس کی بیوی بھی نہیں تھی۔

سوال: ان کا معاشقہ تھا؟

جواب: وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اب اگر تم اس طرح کے کسی آدمی کے ساتھ رہتی ہو تو جو کچھ اس کے ساتھ ہو گا وہ تمہارے ساتھ بھی ہو گا۔ مصیبت کو دعوت دینے والی بات ہوئی اور ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ وہ آدمی کیسا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وجہ سے کسی آدمی کو مار دیا جائے۔

سوال: لیکن سر۔ ایسا انھوں نے پیسے کے لیے کیا یا آئیڈیالوجی کے لیے، ہندوتوا آئیڈیالوجی کے لیے؟

جواب: دونوں کے لیے، آئیڈیالوجی کے لیے بھی اور پیسے کے لیے بھی۔

سوال: اس لیے مجھے پتہ چلا ہے کہ انکاؤنٹر کی بڑی وجہ کرپشن تھا، پیسہ تو تھا ہی اس لیے تو وزیر داخلہ اور افسران دونوں ہی پکڑے گئے؟

جواب: ہاں، اکثر اس طرح کے معاملے میں پیسے کا دخل ہوتا ہے۔

سوال: بہت سے لوگ کہہ رہے تھے کہ اس وزیر داخلہ کی وجہ سے وزیر اعلیٰ تقریباً پھنس چکا تھا؟

جواب: دیکھو۔ جو لوگ معاملے کی تحقیقات میں دل چسپی رکھتے تھے ان کا مقصد وزیر داخلہ تک پہنچنا نہیں تھا۔ نشانے پر تو وزیر اعلیٰ تھا۔

سوال: لیکن سچائی تو یہ ہے کہ وزیر داخلہ صحیح معنی میں ملوث تھا نا۔۔۔؟

جواب: دیکھو، تکنیکی اعتبار سے اس معیار کے مطابق تم وزیر اعلیٰ کو شامل نہیں کر سکتے ہو۔

سوال: سنگھل کے بارے میں مجھے کچھ بتایئے جو اے ٹی ایس کا سربراہ ہے۔ میں بطور دلت اس کی شخصیت کا خاکہ تیار کر رہی ہوں؟

جواب: سنگھل، ویسے تو اچھا افسر ہے۔ اس کا تعلق راجستھان سے ہے لیکن گجرات میں بس گیا ہے۔ سہراب الدین انکاؤنٹر میں وہ بھی موجود تھا۔ ان لوگوں نے اس کو بھی اُٹھایا۔ بڑی مشکل سے وہ بچ پایا ہے۔ وہ عشرت انکاؤنٹر میں بھی تھا۔

سوال: یہ تو سرکار کی شبیہ پر دھبے جیسی بات ہو گئی؟

جواب: ہاں، ہے تو، لیکن کیا کر سکتے ہیں۔

سوال: وہ سب افسران جو ۲۰۰۲ء میں برسر ملازمت تھے کیا ان کی شبیہ خود گجراتیوں کے درمیان خراب ہوئی؟

جواب: گجراتیوں کو بھی محسوس ہوا کہ بعض افسران کچھ بہتر کر سکتے تھے۔ انھوں نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ خود کو بری الذمہ نہیں مانتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک غیر جانب دار افسر کا سلوک کیا گیا۔

سوال: لیکن آپ کو تو ہراساں کیا جا رہا ہے؟

جواب: نہیں۔ لیکن گجراتی لوگ تو مجھے ہراساں نہیں کر رہے ہیں نا۔ غیر سرکاری تنظیمیں کر

رہی ہیں۔

دیکھو، ایک بات تو یہ ہے کہ لاشیں احمد آباد لائی گئیں اور سول اسپتال میں رکھی گئی۔ اس کے بعد علاقے میں کچھ تناؤ پھیل گیا۔ خبریں آرہی تھی کہ کچھ معاملے یہاں وہاں سے آرہے ہیں۔ مجھے بس اس بات کا افسوس ہے کہ ان دو جگہوں پر میں خود نہیں جاسکا جہاں تشدد بھڑک چکا تھا ورنہ مجھے یقین ہے کہ میں نرودا اور میگھنی نگر میں یہ ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک جگہ پر ایک سابق ممبر پارلیمنٹ اپنی سوسائٹی کی چھت سے دس ہزار لوگوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، وہ اپنی ۱۲ بور کی بندوق اُٹھاتا ہے اور بھیڑ پر گولی چلا دیتا ہے۔

سوال: کون ہے یہ آدمی؟

جواب: احسان جعفری، ایک بوڑھا شخص جس کی عمر لگ بھگ ۷۵ برس رہی ہو گی۔ پہلے وہ راجیہ سبھا کا ممبر رہ چکا تھا۔ اس نے گولی چلا دی۔ گولی چلانے کے نتیجے میں دو لوگوں کی موت ہو گئی۔ یہ بات پولیس ریکارڈ کا حصہ ہے۔ جارحیت کے پیچھے (یہ سوچ کار فرما تھی) کہ اب میں کیا کروں؟ ہماری قوت اگر دس ہزار کی ہو اور تمہاری قوت سو افراد پر مشتمل ہو تو میں ایسا نہیں کروں گا۔

سوال: لیکن میں آپ کو چھوڑوں گی کیوں؟

جواب: بالکل صحیح۔ تم کہہ سکتے ہو کہ پولیس نے کچھ نہیں کیا۔ اب ہم نے تو کہا نہیں تھا کہ تم گولی چلاؤ، تم خاموش رہ سکتے تھے، بات یہی ہے۔ نروڈا میں یہی ہوا۔ وہاں بھی ایک جذباتی ہندو نوجوان ایک مسجد کے اوپر چڑھ گیا، اب مسلمانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ ہندو غصے میں آگئے اور فسادات پھوٹ پڑے۔

سوال: تیستا نامی کسی سماجی کارکن سے ملنے کے لیے مجھے کہا گیا ہے؟

جواب: وہ سب سے بڑی بدمعاش ہے تم اُودے مہور کر کا نمبر لے لو، وہ انڈیا ٹوڈے کا

صحافی ہے۔

سوال: اور دوسرا وکیل اس کا نام سنہا ہے؟

جواب: یہ دوسرا بد معاش ہے۔

وہ ناناوتی کمیشن میں مقدمہ لڑ رہا ہے اور اس کے لیے اُسے باہر کے لوگوں سے ڈھیر سارا پیسہ ملتا ہے۔ اس کے بعد یہ عورت ہے جس کا نام تیستا سیتلواد ہے اور سیتلواد گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور پھر یہ آدمی ہے جسے جاوید آنند کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ معاون اڈیٹر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت جاوید کی شادی ہو چکی تھی۔ تیستا کی ان سے جان پہچان بڑھی۔ لیکن تیستا کے والد کو یہ پسند نہیں تھا۔ جاوید نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ منتقل ہو گیا۔ تب سے اس تیستا کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ لیکن ۲۰۰۲ء کے بعد وہ گجرات میں آگئی اور تیزی سے اس نے گجرات میں شہریوں کے حقوق پر کام کرنا شروع کر دیا۔ چوں کہ اس کا تعلق قانون داں گھرانے سے تھا لہٰذا اس نے سبک دوش ججوں کو اکٹھا کر لیا۔ بعد میں ان لوگوں نے کمیونلزم نام کی ایک کتاب بھی شائع کی اور اس طرح سے اس نے (فساد) متاثرین کی حمایت کا کام شروع کر دیا۔ پیسے مشرق وسطی سے آنے لگے۔ ہر شخص نے یہ سمجھا کہ بی جے پی ہار جائے گی۔ بی جے پی نے گجرات میں تو جیت حاصل کر لی لیکن مرکز میں اقتدار کھو دیا اور اس طرح سے وہ مرکز کے لیے پوسٹر گرل بن گئی۔

سوال: کیا اس کو روکنے کے لیے آپ کچھ نہیں کر سکتے تھے؟

جواب: ہم کیسے کر سکتے تھے؟ ہم تو چاہتے تھے لیکن عدالتیں ہمارے اوپر جھپٹ پڑتیں۔

سوال: تب تو وزیر اعلیٰ نے (اس کے بارے میں) اپنی فکر مندی کا اظہار آپ سے رازدارانہ طور پر ضرور کیا ہو گا؟

جواب: ہاں، اس نے کیا تھا۔

سوال: لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ مودی تو فسادات کی وجہ سے ہی بنا ہے نا؟

جواب: ہاں، اس سے پہلے اس کو جانتا کون تھا؟ کون تھا مودی؟ وہ دہلی سے اور اس سے بھی پہلے ہماچل سے آیا تھا۔ وہ بس غیر اہم ریاستوں ہی کا ذمہ دار رہا تھا۔ نہ ہریانہ اہم ریاست ہے اور نہ ہی ہماچل پردیش۔

سوال: یہ حالات اس کے لیے ترپ کا پتہ ثابت ہوئے۔ ہے نا؟

جواب: وہی تو۔ اگر یہ سب نہیں ہوا ہوتا تو وہ بین الاقوامی سطح پر اتنا مشہور نہیں ہوتا۔ اس سے ایک تحریک ملی۔ منفی ہی سہی۔ لیکن کم سے کم مشہور تو ہو گیا۔

سوال: تو کیا آپ اس کے بھروسے کے آدمی ہیں؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ ہاں۔ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ ۲۰۰۲ء کے فسادات کے دوران میں وہاں اس کے ساتھ تھا تو یہ بات ٹھیک ہے۔



یہ ساری گفتگو دو مہینے سے زیادہ طویل مدت میں مختلف میٹنگوں میں الگ الگ آلات و وسائل کے استعمال سے ریکارڈ کی گئی تھیں۔ پانڈے جو خود کو مودی کا چہیتا سمجھتا ہے، مودی سے اپنی قربت کا اظہار بے لاگ طریقے سے کرتا ہے اسے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ مودی کوئی سادھو نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کو عہدوں سے نوازے گا جو نظریاتی طور پر اس کے مخالف ہیں۔ وہ کوثر بی کے قتل کو یہ کہہ کر جائز ٹھہراتا ہے کہ وہ سہراب الدین کے ساتھ رہ رہی تھی جس کو فرضی انکاؤنٹر میں مار ڈالا گیا تھا اور سی بی آئی اس بات کو ثابت کر چکی ہے۔ دوران گفتگو مختلف موقعوں پر جب کبھی سماجی کارکنان کا ذکر آتا تو وہ انھیں بدمعاش اور لفنگے جیسے القابات سے یاد کرنے میں بالکل نہیں شرماتا، اس کے مطابق ان کارکنان کی وجہ سے گجرات کی بدنامی ہوئی ہے۔

اخیر مرحلے میں مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی جب اس نے کہا کہ میں پریمل گارڈن میں چہل قدمی کے لیے جاؤں اور دیکھوں کہ فسادات کے بعد گجراتی کتنی آزادی محسوس کر رہے ہیں۔

پانڈے نے نیپال سے واپسی پر سورت میں مقیم اپنے بیٹے سے ملوانے کی پیشکش کی جو ہیرے کا تاجر تھا۔ اس نے دلی میں امت شاہ سے ملاقات کروانے کے سلسلے میں بھی مدد کرنی چاہی جو فرضی انکاؤنٹر معاملے میں ضمانت پانے کے بعد عدالت کے ذریعے گجرات میں داخلے پر پابندیاں جھیل رہا تھا۔ اس نے تھرو سے بھی بات کی اور اس سے کہا کہ گجرات کی تمام ترقیاتی کہانیوں اور وزیر اعلیٰ کے ذریعے ریاست میں سرمایہ کاری کے حصول کی خاطر کی گئی کوششوں کو سمجھنے کے سلسلے میں میری مدد کرے۔ مختلف کمیشنوں کے ذریعے پانڈے کی تحقیقات کی جارہی تھی۔ سی بی آئی نے اس پر فرضی انکاؤنٹر میں ملوث ہونے کا الزام لگایا ہے۔ احسان جعفری کی اہلیہ نے سپریم کورٹ میں عرضی داخل کی ہے کہ اس نے ان کے شوہر اور دیگر مسلمانوں کو بچانے میں کوتاہی کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن اس کو کوئی فکر نہیں۔ اس نے بڑے لااُبالی پن سے مجھے کہا تھا کہ اس کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

جوں جوں پانڈے کے ساتھ میری گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کو آرہا تھا مجھے اضطرابی دورے تیزی سے پڑ رہے تھے۔ کچھ مدت کے لیے میں شہر کو چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ یہ تب ممکن ہو سکا جب میں نے چکرورتی کے ساتھ اگلا انٹرویو لینے کا ارادہ کیا۔ چکرورتی فسادات کے دوران گجرات کا ڈائرکٹر جنرل آف پولیس رہ چکا تھا اور اب ممبئی میں مقیم تھا۔ چکرورتی ممبئی کے پوش علاقے کھار میں رہتا تھا، پانی میرے ساتھ ممبئی کا سفر کرنا چاہتی تھی اور چوں کہ مائیک کو دوبارہ دہلی کے سفر پر روانہ ہونا تھا اور مجھے ایک معاون کی ضرورت بھی تھی لہٰذا میں اور پانی اگلی پرواز سے ممبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ساڑی لے آئی جو اسے آفس کے کسی رفیق کار نے تحفتاً پیش کی تھی۔ چوں کہ میری ایک قریبی دوست کی

شادی ہورہی تھی لہٰذا میں نے شادی میں شرکت کے لیے پانی کو دعوت دی نیز پانی سے وعدہ کیا کہ ذرا کام ختم ہو جائے پھر میں اُس کو بھارتی تہذیب کی جھلکیاں دکھاؤں گی۔



باب نہم

چکرورتی

میں نے اشوک نارائن سے گزارش کی تھی کہ چکرورتی سے میرے لیے سفارش کر دیں کیوں کہ ان دنوں وہ میڈیا سے دور رہنا پسند کرتا تھا۔ اسی طرح گجرات سرکار سے تعلق رکھنے والے اپنے ہم منصب لوگوں سے بھی دور رہا کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ گجرات فسادات کے دوران وہ ڈائرکٹر جنرل آف پولیس تھا اس لیے میڈیا، بین الاقوامی پریس اور کمیشنوں نے اس کا بہت تعاقب کیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ ممبئی میں واقع پُر تکلف نیم شہری علاقے کھار میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔

جب میں اس سے ملنے کے لیے گئی تو پانی کو گھر پر ہی چھوڑ دیا۔ جب میرے اہل خانہ میتھلی کے بجائے نمّی کہہ کر پکارتے تو پانی بھونچکا رہ جاتی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ میرا عرفی نام ہے۔ لیکن جب بھی پانی مجھے میتھلی کہہ کر پکارتی تو میری ماں کو بہت بُرا لگتا۔ ایک روز جب میں باورچی خانے میں اپنے اور پانی کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی تو میری ماں نے کہا کہ تم اپنے آفس میں جو بھی ڈرامہ کرتی ہو یا کردار نبھاتی ہو اس کو گھر تک لانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ گھر ہے کوئی تھیئٹر تو نہیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ ناراض تھیں۔ وہ میرے نام کی تبدیلی سے نہیں بلکہ اس حقیقت سے پریشان تھیں کہ میں ان دنوں خطرات کے سایے میں جی رہی تھی۔ ایک بار میں نے ان کو اپنے کمرہ میں دیکھا کہ وہ میرا کرتا اپنے ہاتھ میں لیے رو رہی ہیں۔ پھر کہنے لگیں کہ ان کے لیے تمہیں راستے سے ہٹا دینا بہت آسان ہے سونو۔ مجھے بُرے خواب

نظر آتے ہیں کہ ٹرک نے تم کو کچل دیا ہے یا وہ سانپ جس کے ساتھ تم اس ویران گھر میں رہتی ہو اس نے تمہیں ڈس لیا ہے۔ میں ہنسنے لگی، ان کو گلے سے لگایا اور ان کی ڈھارس بندھائی کہ مجھے کبھی کچھ نہیں ہو گا۔ لیکن پھر بھی وہ سسکتی رہیں۔

میں نے باندرہ کے لیے ایک اے سی بس پکڑی جہاں سے آٹو لے کر مجھے کھار جانا تھا۔ چکرورتی وہیں ایک مشہور اسکول کے قریب رہتا تھا۔ اسی عمارت میں ایک مشہور ڈاکٹر بھی رہتے تھے۔ اس لیے مقامی لوگ اس عمارت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چکرورتی خود میرا استقبال کر کے مجھے اپنے گھر میں لے گیا۔ اپنی خوب صورت بیوی سے، جس کا تعلق شاہی گھرانے سے تھا، میرا تعارف کروایا۔ رہائشی کمرے کی روشنی بہت دھیمی تھی اس وجہ سے مجھے فکر ہو رہی تھی کہ اتنی دھیمی روشنی میں کوئی فوٹیج کیسے ریکارڈ کر پاؤں گی۔ ان سے کیا بہانہ بناؤں، کیا ان سے کہوں کہ ٹیوب لائٹ کو آن کر دیں؟

چکرورتی نے مجھ سے میری امریکہ کی زندگی کے بارے میں پوچھا اور ان کی بیوی نے بتایا کہ ان کی بیٹی اداکارہ بننے کا شوق رکھتی ہے اور اس وقت امریکہ میں مقیم ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے مجھے اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ میں ان کی اداکارہ بیٹی کے ساتھ رابطے میں رہوں کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ ہم دونوں اچھے دوست بن سکتے ہیں۔ ان کی ایک دوسری بیٹی بھی تھی جو گھر میں تب داخل ہوئی جب میں مسز چکرورتی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی۔ چھوٹی بیٹی ایک معروف ایئر لائنس کمپنی میں اسٹیورڈ کی ملازمت کر رہی تھی۔ گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ کیسے مشہور شخصیات فلائٹ کے دوران بد اخلاقی پر اتر آتی ہیں۔ ایک مہینے کے اندر تین بار میں چکرورتی سے ملی۔ پہلی ملاقات بہت مختصر تھی، اس ملاقات کو میں نے شوٹنگ کی تفصیلات بتانے، وہاں کے مختلف کمہاروں سے ملنے اور گجرات کے مشہور اتریان فیسٹیول میں جانے کی باتیں بتانے تک ہی محدود رکھا۔ مسز چکرورتی کو اس لذیذ تندوری پنیر کے بارے میں بھی بتایا جو ان کی سہیلی اور اشوک نارائن کی بیوی نے ایک بار دعوت پر مجھے کھلایا تھا۔ مسز چکرورتی جلد

ہی میرے ساتھ مانوس ہو گئیں۔ اپنی ساڑیوں کا کلکشن اور فیملی کی تصویریں مجھے دکھائیں۔

وہاں سے نکلتے وقت میں نے اگلے ہفتے دوبارہ ان کے یہاں آنے کا وعدہ کیا اور حسب وعدہ میں ان سے ملنے بھی گئی۔ اس بار مسز چکرورتی کے لیے پیڑے کا ایک ڈبہ ساتھ لے گئی۔ انھوں نے کافی کے ساتھ پر تکلف ناشتے سے میرا استقبال کیا۔ لیکن چکرورتی کی چپی اب تک نہیں ٹوٹی تھی۔ اس نے اپنی دنیا چند ملاقاتیوں اور دوستوں تک محدود کر رکھی تھی۔ اس کے زیادہ تر دوست پیشہ ور تھے۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ چند موقعوں پر جب وہ احمد آباد گئے تو وہاں ان کو بڑی بے گانگی کا احساس ہوا۔ ان کے شوہر ایک راست باز شخص ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا جیسے کوئی باہری شخص آیا ہو۔

اس کی باتوں کی شوقین بیوی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھے ٹھیک اندازہ ہو گیا تھا کہ چکرورتی کی خاموشی کو کیسے توڑا جا سکتا ہے۔ میں نے ان تمام افسروں کے نام گنوانا شروع کر دیے جن سے میں گجرات میں مل چکی تھی اور جتنی باتیں سنی تھیں ان کے بارے میں بتانے لگی۔ یہ سب کچھ میں بہت بھول پن اور ہیبت کے اظہار کے ساتھ بیان کر رہی تھی۔ چکرورتی کی خاموشی کو توڑنے میں یہ طریقہ کارآمد ثابت ہوا۔

اس سے پہلے کہ چکرورتی کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں لکھوں، گجرات کے اخبارات کی سرخیوں کے متعلق بتانا ضروری ہے جو اس وقت ظاہر ہوئیں جب مین اسٹریم میڈیا نے چکرورتی پر الزام عائد کیا کہ وہ ایک ایسا نااہل ڈائرکٹر جنرل ہے جو فرقہ واریت کی اس آگ پر قابو نہیں پا سکا جس نے گجرات کو ۲۰۰۲ء میں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جب میں اس سے ملی تھی ان دنوں میں بھی وہ سرخیوں میں تھا اور مختلف اخبارات میں شائع اس رپورٹ کی تردید کر رہا تھا کہ سنجیو بھٹ اس میٹنگ میں موجود تھا جسے نریندر مودی نے ۲۷ فروری ۲۰۰۲ء کو بلایا تھا۔ البتہ گواہوں کی اکثریت بشمول اس کانسٹبل کے جس نے سنجیو بھٹ کی بات کی تصدیق کی تھی۔ یہ کہہ کر بعد میں سب مکر گئے کہ سنجیو بھٹ نے ایسا کہنے پر

انھیں مجبور کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سنجیو بھٹ کے دعووں میں زیادہ دم نہیں تھا۔ البتہ اسی سال ایس آئی ٹی انکوائری افسر اے کے ملہوترا نے میٹنگ میں آٹھ لوگوں کی موجودگی کی تصدیق کر دی۔ ان آٹھ افراد میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی، کارگذار چیف سکریٹری سورن کانت ورما، ایڈیشنل چیف سکریٹری (برائے داخلہ) اشوک نارائن، ڈی جی پی کے چکرورتی، احمد آباد کمشنر آف پولیس پی سی پانڈے، سکریٹری (برائے داخلہ) کے نتیانندم، پرنسپل سکریٹری برائے وزیر اعلیٰ پی کے مشرا اور سکریٹری برائے وزیر اعلیٰ انل مکم شامل تھے۔

۲۰۰۲ء میں ہوئے گجرات فسادات کی تحقیقات کا معاملہ ہو یا گجرات میں دیگر مجرمانہ تحقیقات کا ذکر ہو، یا نریندر مودی اور امت شاہ کی قیادت والی ریاست گجرات کی بات کی جائے تو واضح طور پر چکرورتی کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مارچ ۲۰۰۲ء کو ٹائمس آف انڈیا نے ایک رپورٹ شائع کی تھی کہ ڈی جی پی چکرورتی نے پولیس تبادلوں کے معاملے میں گجرات سرکار پر حملوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ (۱۷)

چکرورتی نے اپنے گھر پر دوسری ملاقات کے موقع پر آخرکار میرے جاسوسی کیمرے کے سامنے اپنی خاموشی توڑ دی۔ اس کے بارے میں خبریں آ رہی تھیں کہ اس نے اپنے افسران کی طرف سے ایک موقف اختیار کیا ہوا ہے لیکن کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکا۔ کیوں کہ اس نے تو میڈیا اور اپنے رفقائے کار دونوں کے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے جب دیگر افسران کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا تو چکرورتی کھلنے لگا۔ شاید اس کو احساس ہو گیا کہ ریکارڈ سے پرے ہونے والی بہت ساری بات چیت تک میری رسائی ہو چکی ہے۔ اس طرح سے میں گجرات فسادات کے بارے میں اس سے باتیں اگلوانے میں کامیاب ہو گئی۔

ہر شخص کی نظر میں وہ ایک بدترین واقعہ تھا۔ فسادات کی کوئی منطقی بنیاد نہیں تھی۔ فسادات گودھرا میں ٹرین جلنے کے بعد رونما ہوئے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ

کمپارٹمنٹ میں وی ایچ پی ہی کے لوگ تھے جو ایودھیا سے لوٹ رہے تھے۔ پوری ٹرین ان سے بھری ہوئی تھی، تو ایسا کیا ہوا جس کے بعد فسادات برپا ہو گئے۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عام طور پر جب فسادات بھڑکتے ہیں تو اس کی ایک وجہ ہوتی ہے اور وجہ زیادہ تر مقامی ہوتی ہے، یہاں بھی ایک وجہ تھی جس سے لگا کہ عام ہندو طبقہ کو اس سے خطرہ ہے۔

فسادات میں عموماً غریب طبقہ حصہ لیتا ہے لیکن یہاں تمام امیر طبقہ سڑک پر اتر آیا تھا۔ کچھ لوگوں نے فون کر کے بتایا: 'سر، شوپرز اسٹاپ پر لوگ مرسیڈیز میں بیٹھ کر آ رہے ہیں اور لوٹ مار کرنے میں شامل ہو رہے ہیں۔'

'نہ جانے کب سے تاریخ نے ہندوؤں کو سکھایا ہے کہ غزنی اور بابر نے بھارت پر حملہ کر کے سومناتھ کو تباہ کیا تھا۔ لہٰذا یہ بات یہاں کے ہندوؤں کے دماغ میں گھر کر چکی ہے۔ اس کی وجہ سے بھارت میں فسادات ۱۹۶۵ء سے ہوتے آ رہے ہیں۔ ہزاروں لوگ پہلے بھی قتل کیے جا چکے ہیں۔'

سوال: میرے خیال سے جو چیز مودی کے خلاف گئی وہ اس کا آر ایس ایس سے تعلق نیز فسادات کے دوران آر ایس ایس اور وی ایچ پی کی حمایت تھی؟

جواب: وہ تو ایک لازمی دباؤ تھا۔ ایک شخص جو آر ایس ایس کے کارکن کے طور پر پلا بڑھا ہو اسے تو ان کے مطالبوں کے سامنے جھکنا ہی تھا۔

سوال: مجھے معلوم ہوا ہے کہ فسادات کے دوران وہ آر ایس ایس کے سامنے جھک گیا تھا۔

جواب: اپنی پوزیشن میں وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ خاص طور پر اگر تمہاری تربیت ایسی تنظیم نے کی ہو جو خود ملوث ہو۔ بالخصوص تب جب کہ تم خود ایک اقتدار کی ہوس رکھنے والے وزیر ہو۔

سوال: کیا وہ اقتدار کا بہت بھوکا ہے؟

جواب: ہاں۔

تہلکہ سے پورے احترام کے ساتھ۔

سوال: وہ کیا ہے؟

جواب: یہ ایک رسالہ ہے جس کو ترون تیج پال شائع کرتے ہیں، تم نے اس کے بارے میں ضرور سنا ہو گا۔

یہ رسالہ کہتا ہے کہ فسادات کے دوران کام کرنے والے تمام افسران کو نوازا گیا۔ کوئی ذاتی بات نہیں ہے لیکن مجھے کیا ملا؟ چلو ٹھیک ہے۔ لیکن ہر آدمی کو ایک ہی رنگ میں رنگ دینا غلط ہے۔ یہ جانب داری ہے۔

سوال: کیا ایسا نہیں ہے کہ چوں کہ اکثر لوگ جو آپ کے ساتھ کام کرتے تھے وہ یا تو تنازعات میں گھر گئے یا انھوں نے کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا تھا جس کی وجہ سے آپ بھی نشانے پر آ گئے؟

جواب: لیکن پھر تو آپ زیادہ کچھ اس کے بارے میں کر نہیں سکتے نا۔

سوال: لیکن جس قسم کے آدمی آپ ہیں اس سے تو لگتا ہے کہ گجرات کے ڈی جی پی کے طور پر باقی رہنا بہت مشکل رہا ہو گا؟

جواب: میرا طریقہ کار تھا کہ اپنے دائرہ اختیار میں مجھ سے جو بہتر ہو گا میں وہ کروں گا۔ جتنے مسلمانوں کی مدد مجھ سے ہو سکتی تھی میں نے کی، لوگوں کی بڑی تعداد بچ گئی، صرف اس لیے کہ احسان جعفری نہیں بچ پائے۔۔۔

سوال: احسان جعفری کون ہیں؟

جواب: وہ ایک مسلم اور سابق ممبر پارلیمنٹ تھے جن کو بچایا نہیں جا سکا۔ بھیڑ نے ان کو مار ڈالا، ان کا گھر جلا دیا گیا۔ پورے علاقے پر حملہ ہو گیا۔ پولیس وقت پر نہیں پہنچ سکی۔

سوال: چوں کہ آپ ڈی جی تھے تو کیا اس لیے آپ تنقید کا نشانہ بنے؟

جواب: دیکھو، میری ماتحتی میں بہت سے لوگ کام کرتے تھے۔ ایک تسلسل اور افسر شاہی نظام ہے۔ احمد آباد کا کمشنر، اس کا انسپکٹر جنرل اور پھر اس کا ماتحت۔ میں نے کمشنر کو احکامات دیے۔ اس سے سوال بھی کیا لیکن کمشنر کہتا ہے کہ اس نے اپنے افسران کو حکم دے دیا تھا۔ البتہ جب تک وہ پہنچے تب تک وہ (احسان جعفری) مارے جا چکے تھے۔ نقصان ہو چکا تھا۔ لہٰذا ناناوتی عدالت انکوائری اس معاملے کو دیکھ رہی ہے اور سپریم کورٹ میں بھی یہ معاملہ زیر غور ہے۔

سوال: یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ آپ دوسروں کے کرتوت کی قیمت چکا رہے ہیں اور وہ لوگ اب ریاست کے ذریعے انعامات لوٹ رہے ہیں؟

جواب: یہ تو ہونا ہی تھا۔ اسی وجہ سے میں کہہ رہا ہوں کہ میڈیا جانب دار رہا ہے۔ اس نے کہانی کے دونوں پہلوؤں کو نہیں سنا۔

سوال: فسادات کے دوران جو موقف آپ نے اختیار کیا اس کی وجہ سے آپ کبھی ان کے چہیتے تھے ہی نہیں؟

جواب: مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ میں وہ کبھی نہیں بن پایا۔ کسی نہ کسی طرح سے میں نے ہمیشہ وہی بیان کرنا چاہا جو کچھ میں کرتا تھا۔ وہ بے معنی نہیں تھا۔

سوال: اس وقت فسادات کے دوران کیا آپ نے اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی؟

جواب: ہاں، کچھ خاص باتوں کی طرف میں نے نشان دہی کی تھی لیکن یہاں تو سلسلۂ مراتب اور افسر شاہی نظام ہے جس کا سامنا تم کو بھی کرنا ہے۔

سوال: وزیر اعلیٰ تک بلاواسطہ رسائی آپ کو نہیں تھی؟

جواب: دیکھو، ایک نظام ہے۔ تم سرکار پر دھونس نہیں جما سکتے۔ کام کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ایک نظام ہے۔ ایک مرحلے کے بعد تم زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سرکار کی نظر میں بعض باتیں تم لا سکتے ہو لیکن اگر وہ کوئی کارروائی نہ کرنا چاہے تو اس کے بعد

تم کیا کر سکتے ہو۔

سوال: کیا آپ اس بات سے پریشان تھے کہ جو کچھ بھی آپ زیر غور لاتے تھے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا تھا؟

جواب: ہاں، لیکن پھر بات یہ آتی ہے کہ یہ سب کھیل کا حصہ ہے۔(۱۸)

سوال: لیکن اس کے بارے میں آپ کو لکھنا یا بولنا چاہیے کہ واقعی فسادات کے دوران کیا ہوا؟

جواب: میری بیٹیاں بھی اس کا مشورہ دیتی رہتی ہیں کہ۔۔۔

سوال: فسادات کے معاملوں کو دیکھنے کے لیے جو انکوائری کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تھیں ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: ایک تو بنرجی کمیٹی کی رپورٹ تھی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ ایک سازش تھی لیکن اس کا قانونی اور عدالتی طرز عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے اس کا اعتبار تو نہیں کیا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ کسی بھی گواہ سے جرح نہیں کی گئی۔ اس کے بعد سپریم کورٹ کے ذریعہ متعین کردہ ایس آئی ٹی ہے جس کو انفرادی معاملوں میں تحقیقات کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اور پھر باری آتی ہے ناناوتی کمیشن کی جس کو ریاست نے قائم کیا تھا۔

سوال: کیا آپ کی جرح تمام کمیٹیوں نے کی؟

جواب: ہاں۔

سوال: زیادہ اثر دار کون سی کمیٹی تھی؟

جواب: دیکھو ویسے تو ناناوتی کمیشن ان کے لیے زیادہ کارگر تھی، تم سمجھ رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔(۱۹)

سوال: آپ کا مطلب ہے سرکار؟

جواب: بالکل صحیح، دیکھو میں ان کے قانونی چارہ جوئی کرنے والے مسلم وکلا دفاع یا میڈیا کے سامنے جا کر یہ سب تو نہیں بولوں گا۔ ہاں البتہ میں مناسب کمیشن کے سامنے بولوں گا۔

سوال: اور سپریم کورٹ نے جس کو قائم کیا تھا اس کو تو غیر جانب دار ہونا چاہیے؟

جواب: ہوا یوں کہ احسان جعفری کی بیوہ نے شکایت داخل کی تھی۔

سوال: آپ کے وزیر داخلہ بھی گرفتار کیے گئے تھے؟ کیا آپ نے اس کی ماتحتی میں کام کیا ہے؟

جواب: اوہ، ہاں۔ اس کے ساتھ میری ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔

سوال: فسادات کے دوران؟

جواب: نہیں، فسادات کے بعد، اکشر دھام واقعہ کے بعد وہ آیا تھا۔

سوال: اور آپ ایک ایسے آدمی کی ماتحتی میں کام نہیں کر سکتے تھے جو بے ایمان ہو؟

جواب: صرف بے ایمانی ہی کا معاملہ نہیں بلکہ ذہنیت کا بھی معاملہ تھا۔ وہ گرفتار ہو گیا کیوں کہ کال ریکارڈ موجود تھے جو اس کی مجرمانہ حرکت کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

سوال: آپ اس کی ماتحتی میں کس حیثیت سے کام کر رہے تھے؟

جواب: ڈی.جی

سوال: اس لیے آپ بچا لیے گئے؟

جواب: ارے نہیں، اس نے تو مجھے بہت پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

سوال: کیا فسادات کے دوران آپ گھٹن محسوس کرتے تھے؟ کیا آپ نے اس صورت حال کا مقابلہ کیا؟

جواب: ہاں میں نے مقابلہ کیا۔ اندر رہتے ہوئے مقابلہ کرنے کے لیے بھی ایک الگ طرح کی چیز درکار ہوتی ہے۔ ایک چیز ہے بہادری یا عوام اور میڈیا کے پاس جانا۔

درحقیقت ٹائمس آف انڈیا نے میرے خلاف لکھتے ہوئے کہا کہ اگر چکرورتی کے پاس ضمیر ہوتا تو وہ استعفیٰ دے دیتا۔ میں کیوں استعفیٰ دیتا؟

کیا میں گنہگار تھا؟ کیا میں فسادیوں کے ساتھ سازباز کر رہا تھا؟ اس کے برعکس میں اپنی طرف سے لوگوں کو بچانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ جو آدمی میری جگہ آئے گا وہ شاید ان کی مدد کرے گا۔(۲۰)

سوال: کیا اگر آپ وہاں نہیں ہوتے تو ایسا ہونے کا امکان تھا؟

جواب: ہاں۔

سوال: اگر بند کا اعلان نہیں کیا جاتا تو کیا حالات بہتر ہوتے؟

جواب: بالکل اور اس کا اعلان وی ایچ پی نے کیا تھا۔

سوال: جس کی حیثیت مرکز جیسی تھی؟

جواب: ٹھیک، وی ایچ پی برسر اقتدار جماعت بے جے پی کا ایک بازو ہے۔

سوال: کیا اس نے یہ احکامات دیے تھے کہ کارروائی نہ کی جائے؟

جواب: انھوں نے کوئی غیر قانونی احکامات مجھے نہیں دیے۔ وہ اپنی موت کے پروانہ پر دستخط نہیں کرتا۔

سوال: احکامات تو خفیہ طور پر دیے جا سکتے ہیں؟

جواب: ایسا ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق کی بنیاد پر ہوگا۔ ایسے بیس لوگوں کے سامنے نہیں ہوگا جن میں سے پانچ ہو سکتا ہے کہ تمہارے خلاف ہوں۔(۲۱)

سوال: جو کتاب آپ لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں کیا اس سے بیوروکریسی اور پولیس فورس میں ہلچل مچے گی؟

جواب: جب تک میں ان کے نام نہ لوں محض واقعات بیان کر دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔

سوال: کیا ان واقعات کے بعد آپ کو حاشیے پر ڈال دیا گیا تھا؟

جواب: ایسا ہے کہ اشوک نارائن کی شکل میں میرا ایک دوست موجود تھا جس کے ساتھ میں اتفاق رکھتا تھا۔ سباراؤ چیف سکریٹری بھی میرا دوست تھا لیکن صحیح معنی میں نہیں کیوں کہ جو کچھ وہ کرتا تھا اس سے مجھے اتفاق نہیں تھا۔

سوال: یہ بھٹ کا کیا معاملہ ہے؟ وہ بات جس کے بارے میں آپ اس دن بتا رہے تھے؟ وہ ویب سائٹ جس کا آپ نے ذکر کیا اس میں اس کا بیان آیا تھا؟ کیا وہ سچ ہے؟

جواب: یہ بات اس معنی میں صحیح نہیں ہے کہ وہ ایک ایس پی درجہ کا افسر تھا۔ انٹیلیجنس میں ایس پی رائیگار ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل تھے جو اس اہم دن غائب تھے۔ لہٰذا انھوں نے سوچا ہو گا کہ وہ چلا جائے تاکہ نمائندگی ہو جائے گی۔ لیکن چوں کہ وہ میٹنگ مختلف ڈپارٹمنٹ کے سربراہان کی تھی اس لیے وہ ایک حصہ دار نہیں تھا۔ جناب اشوک نارائن اس بات کی تصدیق کریں گے جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔

سوال: ویسے دفنالہ میں رہنے والے آپ کے کچھ دوستوں سے میں مل چکی ہوں۔ سب کے سب افسران، پی سی، پی پی۔۔۔

جواب: ہاں۔ ہاں۔ سب وہیں رہتے ہیں۔ وہاں وہ کلدیپ شرما بھی ہے۔

سوال: ارے ہاں، پی سی پانڈے کہہ رہا تھا کہ مجھے اس آدمی سے ملنا چاہیے جو بھیڑ اور اون ڈپارٹمنٹ میں اب کام کرتا ہے؟

جواب: کلدیپ ایک اچھا آدمی ہے۔ سرکار سے اس کی نہیں بنی اس لیے اس کو کنارے کر دیا گیا۔ پہلے اس کا رویہ ایسا ہوتا تھا گویا اصل میں وزیر اعلیٰ وہی ہو۔ ورنہ وہ افسر اچھا ہے۔ آج اس کو ڈی جی ہونا چاہیے تھا لیکن اس کو صرف اس لیے کنارے کر دیا گیا کیوں کہ وہ (ان کے) خلاف چلا گیا اور ایسا کر دیا جس سے ان کو عدالت نہ جانا پڑے۔ سرکار چوں کہ بہت چالاک ہے اس لیے اس کو اس نے سائڈ پوسٹنگ دے دی ہے۔ یہ مودی بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ (۲۲)

سوال: وہ سباراؤ؟ کوئی اس کو پسند نہیں کرتا ہے، نارائن کی بیوی کہہ رہی تھی کہ وہ سرکار کی ڈفلی بجاتا تھا؟

جواب: اچھا وہ چیف سکریٹری، ان لوگوں نے تو اس کو خوب نوازا ہے، اس لیے وہ تو صرف اچھی اچھی باتیں کرے گا ہی۔

سوال: تو کیا سباراؤ فسادات کے دوران سرکار کے ساتھ سازش میں شامل تھا؟

جواب: ہاں ہاں، پورے طور پر، وہ اپنے باس کے بہت قریب تھا۔

چکرورتی یہاں پر گجرات کے چیف سکریٹری سباراؤ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جس کے بارے میں ہر فرد نے جس سے بھی میری ملاقات ہوئی یہی بتایا کہ وہ گجرات فسادات کے دوران وزیر اعلیٰ کا آدمی ہوا کرتا تھا۔

ایک اخبار میں شائع رپورٹ کے مطابق سباراؤ ایک سابق چیف سکریٹری ہے جو ۲۰۰۳ء میں سبکدوش ہوا۔ انعام کے طور پر اس کو گجرات انرجی ریگولیٹری کمیشن (جی ای آر سی) کا چیئرمین بنایا گیا۔ عام طور سے اس عہدے پر گجرات کے سبکدوش جج فائز ہوتے ہیں۔ تجزیہ کاروں کا ماننا تھا کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ انعام اس کو کیوں ملا ہے۔

سوال: ویسے تو آپ کا نام بھی ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہے جنھوں نے سرکار کا ساتھ دیا تھا؟

جواب: ہاں (تہلکہ) میگزین نے یہ بات کہی تھی کہ مجھے فائدے حاصل ہوئے، لیکن مجھے کون سا انعام ملا ہے؟ بقیہ سب لوگ نوازے گئے ہیں۔ خواہ وہ چیف سکریٹری ہو، داخلہ سکریٹری ہو یا پولس کمشنر۔

نکتہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص حقیقت پسند ہونے کی کوشش کر رہا ہو تو پھر یہ نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: لیکن سنجیو بھٹ والی بات بھی تو ہے؟ اس نے بھی تو آپ کا نام لیا ہے؟

جواب: ہاں، تمہیں سری کمار سے بھی ملنا چاہیے۔ کیا تم اس وزیر کی بات کر رہی ہو جو میرے دفتر میں آیا تھا؟ وہ وزیر میرے دفتر میں تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔ اس کا نام آئی کے جڈیجہ ہے۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو مجھ سے بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کمرہ میں رہے۔ اس لیے میں نے اپنے آدمی سے کہا کہ اس کو دوسرے کمرے میں بٹھائے۔ میں اپنے کنٹرول سے متعلق کاموں میں مشغول تھا۔ تبھی اس شخص (سنجیو) نے اس کو دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہو گا۔ اس لیے اس کی مداخلت کا تو سوال نہیں اُٹھتا۔

سوال: لیکن اگر بھٹ وہاں پر رہا بھی ہو تب بھی آج کوئی یہ نہیں کہے گا۔ کیوں کہ کوئی بھی اپنی گردن پھنسانا نہیں چاہے گا۔

جواب: دیکھو، اگر وہی آخری سچائی ہے تو میرا محدود جواب اس سلسلے میں یہی ہو گا کہ سرکار نے ایک جوڈیشیل کمیشن متعین کیا تھا اور جس کا اعلان مارچ کے مہینے میں اسمبلی کے اندر کیا گیا تھا۔ اب اس کے بعد سے جب کہ فسادات دھیرے دھیرے ختم ہو گئے تو پھر اپنے پاس ساری معلومات رکھنے کا دعویٰ کرنے والے لوگوں نے کچھ کیوں نہیں کیا؟ ایک معقول مدت میں وہ ایک حلفیہ بیان داخل کر سکتے تھے، جیسا کہ اس سری کمار نے کیا۔ اس نے پانچ حلفیہ بیانات داخل کیے تھے۔

سوال: لیکن تہلکہ میں شائع ہونے والے اس مضمون کی سرخی کہتی ہے کہ یہ آدمی سچ بتا سکتا ہے؟

جواب: میں نے اس سے پوچھا تھا کیوں کہ مئی کے مہینے میں مسٹر رائیگار کا تبادلہ ہو گیا تھا اور فسادات کا سلسلہ ہنوز جاری ہی تھا لہٰذا سری کمار کی تقرری ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل برائے انٹیلیجنس کے طور پر ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ حلفیہ بیان داخل کرے، لہٰذا اس نے داخل بھی کیا، اور اپنی مرضی سے کیا۔ اس میں ایک لفظ بھی نہ تو میرے بارے میں

تھا اور نہ کسی اور کے بارے میں۔ پھر دو چار مہینوں کے بعد اس نے دوسرا حلفیہ بیان داخل کیا جس میں اس نے کہا کہ چکرورتی نے یہ کہا اور وہ کہا۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ مسٹر کمار نے اس وقت ایک حلفیہ بیان داخل کیوں نہیں کیا۔ اگر وہ رام چندر کی ایسی اولاد ہے تو اسے آگے بڑھ کر اس وقت یہ بات کہنی چاہیے تھی، دراصل یہ اس لیے ہوا کیوں کہ ترقی میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور تب تک میں بھی ممبئی منتقل ہو چکا تھا۔

یہ بات کبھی ویسے حوالہ کے طور پر پیش نہیں ہو گی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ آدمی روزانہ مجھے فون کر کے کہتا تھا کہ سر برائے مہربانی آپ گجرات آجایئے کیوں کہ مجھے سرکار کے خلاف سی اے ٹی میں مقدمہ دائر کروانا ہے ترقی نہ ملنے کے معاملے میں۔ میں نے کہا کہ نہیں آسکتا کیوں کہ میں ممبئی میں ہوں۔ کئی بار تو اس کے اہل خانہ کے فون آئے، اس نے کہا کہ سر سی اے ٹی کے سامنے آپ کو بس اتنا کہنا ہو گا کہ سری کمار جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات میں کیسے کہہ سکتا ہوں؟ کہاں ۲۰۰۲ء اور کہاں ۲۰۰۵ء۔ آج اس کے بارے میں بات کیوں ہو رہی ہے؟ لہٰذا اس نے میرے خلاف تین حلفیہ بیانات لکھے۔ وہ گھر میں بیٹھ کر ڈائریاں بناتا رہتا ہے، یہ کوئی سرکاری کیس کی ڈائری نہیں ہے۔

لہٰذا یہ بھٹ بھی اسی کی ذات والا ہے۔ اور یہی سب لوگ تب سرکار کے ساتھ ہوا کرتے تھے جب سب کچھ اچھا چل رہا تھا۔

سوال: تو کیا جڈیجہ والی میٹنگ متنازع میٹنگ تھی؟

جواب: نہیں، وزیر اعلیٰ کی میٹنگ متنازع تھی۔

سوال: کیا یہ بھٹ اس میٹنگ میں تھا؟

جواب: نہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا۔ رائیگار اس میٹنگ میں حاضر نہیں تھا اس لیے بھٹ نے اپنی مرضی سے اس میٹنگ کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن اشوک نارائن کو محسوس ہوا کہ چوں کہ یہ سربراہان کی میٹنگ ہے اس لیے اس کو اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اب اگر تم خطروں سے کھیلنا چاہتے ہو تو جا کر اپنا چہرہ دکھا سکتے ہو۔

جہاں تک سورن کانت کا معاملہ ہے تو اس کے پاس میٹنگ میں آنے کے لیے جائز بنیاد موجود تھی۔

سوال: اس کا مطلب ہر چیز اور ہر شخص تنازع میں پھنسا ہوا ہے، چاہے معاملہ انکاؤنٹر کا ہو یا فسادات کا؟

جواب: ہاں، ہاں۔ جیسے کہ ایک وزیر داخلہ بھی گرفتار کیا جا چکا ہے۔

سوال: کیا سب افسران اس کو ناپسند کرتے ہیں؟

جواب: ہاں، ہاں۔ ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے۔

سوال: لیکن کیوں اس جیسا آدمی وزیر داخلہ کے عہدہ پر فائز ہے؟

جواب: سیاسی تعلقات کی وجہ سے بس۔ امت شاہ اور میرے بیچ ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ کلدیپ شرما جب اے سی بی میں تھا تب اس نے اس کے خلاف ایک معاملہ درج کیا تھا۔

سوال: تو شاہ نے آپ کے ساتھ کیا کیا؟

جواب: میں نے کاغذ پر کبھی دستخط ہی نہیں کیے۔

سوال: آپ لوگوں نے شکایت درج کیوں نہیں کرائی؟

جواب: سیاسی طور پر وہ بہت مضبوط تھا، جب تک احکامات تحریری شکل میں دے رہا تھا (کچھ نہیں ہو سکتا تھا) اچھی بات یہی تھی کہ وہ خطوط پر دستخط خود کرتا تھا۔ پرسنل اسسٹنٹ بھی نہیں، پہلے وہ وجہ بتانے کی کوشش کرتا تھا کہ ان کو بدلنا ہے۔ ان کو چیلنج کرنا ہے لیکن بعد میں وہ خود ہی احکامات پر دستخط کر دیتا تھا۔ وہ ایسے احکامات پر

بھی خود دستخط کرتا تھا جن پر ماتحت کارندوں کو دستخط کرنا ہوتا ہے۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہو رہا تھا۔

سوال: وہ احکامات کیا تھے؟

جواب: افسران کے تبادلے کے احکامات۔ 'یہ میرا آدمی ہے، اس کو یہاں رکھو۔' تو میں اس سے کہتا تھا: 'سر، گورنمنٹ آرڈر دے گا، تو میں کرے گا۔' تو جھٹ سے دوسرے ہی دن احکامات آجاتے تھے، اور اس طرح سے اشوک نارائن کو شاہ کے غصہ سے بچایا گیا۔

سوال: ایک دوسری وزیر تھی مایا کوڈنانی؟

جواب: اوہاں، وہ نروڈا معاملہ میں ملوث تھی۔ معاملہ سپریم کورٹ میں چل رہا ہے۔

سوال: لیکن وہ تو بڑی معصوم دکھتی ہے، کیا واقعی وہ ملوث تھی؟

جواب: وہ ملوث تھی، آر ایس ایس والوں کی شکل پر مت جاؤ ان کے حلیے فریب کن ہوسکتے ہیں۔

چکرورتی ایک منتشر افکار کا حامل شخص ہے۔ اس کے پاس اس کے اپنے ہی وردی پوش لوگوں کے بارے میں تلخ حقائق موجود ہیں، اس کے بقول اس نے بولنے میں اتنی دیر لگادی کہ انصاف نہیں ہوسکتا۔ (مثال کے طور پر سری کمار)، شاید اس بات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ سری کمار نے بولنے میں دیر کر دی یا یہ کہ سنجیو بھٹ کے ذریعے پیش کردہ سچائی میں دم نہیں ہے یا اس سے کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ہے۔ لیکن کیا اس سے چکرورتی ریاستی ڈی.جی کے طور پر اپنی ساری ذمہ داریوں سے بری ہو جاتا ہے؟ یہ واقعی ایک انتہائی مشکل کام ہے کہ ایک ڈی.جی یا پولیس رینک کے دوسرے افسران حکومت کے زور آور اور اعلیٰ عہدے داروں کو آڑے ہاتھوں لے سکیں۔ اس معاملے میں تو ان کا پالا امت شاہ سے پڑا تھا جس کے بارے میں تمام لوگ بشمول سنگھل، رائیگار، اشوک نارائن، پریادرشی اور اب خود چکرورتی متفقہ طور

پر بتارہے ہیں کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جس کو قانون اور نظام کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔ افسران کو غیر قانونی احکامات جاری کیا کرتا تھا۔ لیکن کیا خاموش رہ کر چکرورتی فرقہ وارانہ تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچا رہا تھا؟



باب دہم

مایا کوڈنانی اور دیگر افراد

احمد آباد میں میں اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونے لگی تھی یا بقول آج ایسا لگتا تھا کہ میں خالص آمداوادی ہوتی جارہی تھی۔ میں یہ سیکھ گئی تھی کہ ایک بجے رات کو احمد آباد کے اَپر کرسٹ (مشہور بیکری) سے ایپل پائی کیسے حاصل کرنا ہے۔ ہاسٹل کی لڑکیاں اور میں رات کے دو، دو بجے باہر جاکر انڈے کھاتے تھے۔ درگا پوجا پنڈال اور گربا کے نو دنوں کے دوران 'پانی' اور میں نے ناچ ناچ کر کے اپنے پاوں سرخ کرلیے تھے۔

ہم نے کھانے کے لیے ایک جگہ ڈھونڈلی تھی جہاں پر بہترین کاٹھیاواڑ گاٹھیا اور اور دیگر پکوان ملتے تھے جو بڑی خوب صورتی سے لال مرچ سے سجائے جاتے تھے۔ ایک موقع پر جب مجھے تین دن کے لیے نہرو فاؤنڈیشن والا کمرہ خالی کرنا پڑا تو این آئی ڈی ہاسٹل میں بطور طالبہ مجھے جگہ مل گئی۔ میں جس طالبہ کے ساتھ کمرے میں رہتی تھی وہ صبح تک جاگ کر اپنے بوائے فرینڈ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ چوں کہ زمانہ طالب علمی میں مجھے ہاسٹل میں رہنے کی بڑی خواہش تھی اس لیے احمد آباد میں میں نے زندگی کے اس پہلو کا بھی خوب لطف اٹھایا۔

تاہم میرے لیے ہر چیز باعث مسرت نہیں تھی کیوں کہ آخر کار مائیک کو الوداع کہنے کا وقت آگیا تھا۔ الوداعی عشائیہ کے لیے ہم لوگ پکوان ڈھابہ چلے آئے جو مائیک کا پسندیدہ تھالی جوائنٹ تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ میں احمد آباد کی کچھ دلکش تصویریں تھیں۔ اس وقت تک مائیک معقول ہندی بولنا سیکھ چکا تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے کمروں میں جانے سے پہلے پوری

رات باتیں کرتے رہے۔ صبح کے دس بجے اس کو دہلی کے لیے فلائٹ لینی تھی۔ اگلی صبح اپنے دروازہ کے نیچے مجھے ایک تصویر اور مور کے پنکھ ملے۔ تصویر ہندو دیوتا کرشن کی تھی جس کی پشت پر مائیک نے ہندی میں لکھا تھا: 'پیاری میتھلی، اپنا خیال رکھنا۔' میرا دوست، میرا اسکون اور میرا شریک واردات مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ اب بات کرنے کے لیے ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو مجھے رعنا ایوب کے نام سے جانتا ہو۔

مائیک ۲۰۱۱ء میں ایک روز کے لیے اپنا آخری کردار ادا کرنے کے لیے احمد آباد واپس آئے گا۔

جب میں دوبارہ احمد آباد آئی تو یہ ۲۰۱۳ء کا کوئی مہینہ تھا۔ مجھے کچھ دستاویزات حاصل کرنے تھے۔ مایا کوڈنانی سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکی تھی۔ اسٹنگ کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ میں اب بھی منتظر تھی کہ اس کہانی کو دن کی روشنی نصیب ہو جائے جب کہ تہلکہ میں میرے کام کا سلسلہ جاری رہا۔

دستاویزات کے سلسلے میں جس افسر سے میری ملاقات ہوئی، اس نے مجھے بتایا کہ جیل میں وہ مایا کوڈنانی سے مل چکا ہے۔ تاہم وہ سوچ رہا ہے کہ مایا بین کے لیے جیل میں اوشو کی کتابیں بھجوا دے۔ یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے بتایا: 'وہ روتی رہتی ہے اور مجھ سے کہتی ہے کہ مجھے باہر نکالو۔ وہ جنون کی حد تک پہنچ رہی ہے۔ مجھے لگا کہ روحانیت سے شاید اس کو کچھ مدد مل جائے۔'

خفیہ تفتیش کے دوران ایک مرتبہ دوپہر کے کھانے کے وقت جب میں مایا بین کے گھر گئی تو اس نے میرے سامنے آم رس پیش کیا۔ آم کا موسم تو گزر چکا تھا لیکن اس نے آم پر کریم لگا کر اس کو فریزر میں اپنے بیٹے کے لیے اسٹور کر رکھا تھا۔ جو جلد ہی اس سے ملنے امریکہ سے آنے والا تھا۔ اس نے مجھے گلے لگا کر کہا: 'تم کھاؤ، مجھے لگے گا کہ میرا بیٹا ہی کھا رہا ہے۔ تم بھی میرے لیے میری بیٹی میتھلی جیسی ہی ہو۔'

دوپہر کے وقت میں نے اس کے سامنے گیتا سار کی تشریح پیش کی جسے میں نے مبینہ طور پر اپنے سنسکرت پڑھانے والے والد سے سیکھا تھا۔ وہ اس بات سے متاثر تھی کہ بیرون ملک رہنے والی ایک لڑکی مذہب کے بارے میں یہاں رہنے والے لوگوں سے بھی زیادہ جانتی ہے۔ اس نے کہا: 'میں کہتی ہوں میتھلی کہ ہم نے اپنی تہذیب گنوادی ہے۔ ان مسلمانوں کو دیکھو، ان کے بچے بھی کتنے کٹر ہوتے ہیں۔'

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دوپہر کا کھانا بہت سادہ تھا جس میں صرف دو قسم کی سبزیاں، پاپڑ اور پوریاں تھیں۔ مایا بین نے کھانا خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا، میں کھا رہی تھی اور وہ کھلا رہی تھی۔

شام کو ہم نے گفتگو کا آغاز کیا۔ مسلم طبقے کے تئیں جو نفرت اس کے اندر تھی اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا، البتہ جو شدید نفرت اس میں مودی کے خلاف تھی اس کا اظہار میرے ساتھ گفتگو کے دوران ہوا۔ اس کو یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی کہ مودی نے بڑی آسانی سے اس کے اور گوردھن زدافیا کے خلاف مقدمات کا استعمال کیا تاکہ جنھیں وہ پسند نہیں کرتا انھیں راستے سے ہٹایا جاسکے۔

'یہاں کی نئی نسل کو کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ اگر کچھ ہو بھی جائے تب بھی یہ نسل سڑکوں پر کبھی نہیں اُترے گی۔'

'دیکھو ہمارے مذہب میں سکھایا جاتا ہے کہ ایک چیونٹی کو بھی نقصان نہ پہنچاؤ۔ ہمارے بچوں کو بچپن سے ہی یہی سکھایا جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ان لوگوں کو بچپن سے کیا سکھایا جاتا ہے؟ ان کو سکھایا جاتا ہے کہ تمھیں مارنا ہے، اگر تم مارتے ہو تبھی تم ایک مسلمان کہلاؤگے۔ یہ لوگ کیا سکھاتے ہیں کہ آپ ایک آدمی کو بھی مسلمان بناؤ تو آپ کو جنت میں حور ملے گی۔ یہ سب کچھ مدرسوں میں سکھایا جاتا ہے۔ لیکن کم از کم تم اپنے بچوں کو یہ تو سکھاؤ کہ تم ایک بھارتی ہو۔ یہ برداشت نہیں کیا جائے گا کہ پاکستان جیتے اور تم پٹاخے

چھوڑو۔'

سوال: ابھی ان لوگوں کو ۲۰۰۲ء کے بعد کم نہیں ہوا ہے؟

جواب: ہاں ابھی تھوڑا کم ہوا ہے۔

سوال: تو آپ عدالت میں تقریباً آٹھ گھنٹے گزارتی ہیں؟

جواب: کیا کروں؟ میں تو اپنی پریکٹس گنوا رہی ہوں، لیکن وہ لوگ مجھے عدالت سے بچا نہیں سکتے کیوں کہ وہاں ۸۰ لوگ اور ہیں۔ تیستا جیسے لوگ چیخنا شروع کر دیں گے۔

سوال: لیکن مجھے ایک بات بتائیے۔ نریندر مودی کے ارد گرد بہت چاپلوسی ہوتی ہے۔ ہے نا؟ میرا مطلب ہے کہ ہر اچھے کام کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔

جواب: ابھی کے لیے اچھا ہے لیکن لمبی مدت کے لیے یہ بُرا ہے۔

سوال: کیا آپ ان کی چہیتی ہیں؟

جواب: میں اس کی چہیتی ہوا کرتی تھی۔

سوال: اگر کچھ نہیں تو کم از کم گجرات کے لوگ وہ چیزیں نہیں بھولیں گے جو آپ نے ان کے لیے کیا ہے؟

جواب: وہ اس کو کبھی نہیں بھولیں گے، وہ میرے ساتھ ہیں۔

سوال: امت شاہ والی بات کے بعد مودی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

جواب: اپنی گرفتاری اور ضمانت کے بعد میں نے اس سے بات نہیں کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو موقعوں پر ہم دوبار ملے ہیں۔

سوال: تو جب وہ آپ کو دیکھتا ہے تب اس کا رد عمل کیا ہوتا ہے؟

جواب: اس کا کوئی رد عمل نہیں ہوتا۔ نہ ہی کچھ کہتا ہے۔ میں بھی کچھ نہیں کہتی، ویسے بھی یہ میری پریشانی ہے میں اس کو سنبھال لوں گی۔ بھگوان میری مدد کرے گا۔ کسی سے مدد کی امید میں کیوں کروں؟

میں جانتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں اور بھگوان میری مدد کرے گا۔ میں وہاں نہیں تھی میتھلی۔ اس جگہ سے میں ۲۰ کلومیٹر دور تھی۔ میں سولا میں تھی۔ میں اسمبلی گئی تھی جو ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوئی۔ میں وہاں گئی۔ میں نے شروعات اپنے گھر سے کی، آنندی بین کے دفتر گئی۔ ہم وہاں گئے۔ ہم نے وہاں باتیں کیں۔

سوال: پھر تو آنندی بین سے بھی پوچھ گچھ کی جانی چاہیے۔ ہے نا؟

جواب: مجھے نہیں پتا۔ وہاں سے میں اسپتال گئی کیوں کہ ساری لاشیں سولا کے سول اسپتال میں موجود تھیں۔ میری نرس کے والد گودھرا کے متاثرین میں سے ایک تھے۔ میں وہاں ان کی لاش کی شناخت کے لیے گئی تھی۔ امت شاہ اور میں دونوں سول اسپتال گئے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں نے بھی مجھے وہاں اذیت پہنچائی۔ وہ غصے میں تھے، انھوں نے میرے اور امت شاہ کے خلاف نعرے لگائے۔ پولیس انسپکٹر مجھے اپنے ساتھ اپنی کار تک لے گیا اور وہی وہاں سے مجھے لے کر گیا۔

سوال: تو الزام کیا ہے؟

جواب: وہ گواہوں کو استعمال کر رہے ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں فسادیوں کو بھڑکا رہی تھی اور بھیڑ کی قیادت کر رہی تھی۔ میں تو اپنے اسپتال آگئی تھی۔ زچگی کی ایک مریضہ کو دیکھا۔ ۳ بجے میں اسپتال گئی۔ انھوں نے کہا کہ چوں کہ موبائل اس علاقے میں تھا اس لیے میں وہاں ہی تھی۔

سوال: گوردھن زدافیا وزیر داخلہ تھا۔ کیا اس کو بھی اسی وجہ سے برطرف کیا گیا؟

جواب: نہیں، اس کو اس لیے ہٹایا گیا کیوں کہ وہ وزیر اعلیٰ کے چہیتوں میں شامل نہیں تھا۔

سوال: تو کیا وزیر اعلیٰ نے گوردھن بھائی کو بچانے کے لیے گواہوں کا استعمال نہیں کیا جس طرح اس نے امت شاہ کے معاملہ میں کیا تھا؟

جواب: (ہنس کر) نہیں۔

سوال: کیا فسادات ہی کی وجہ سے اس نے گوردھن زدافیا سے بھی پیچھا چھڑا لیا؟

جواب: ہاں۔ وہ چلا گیا۔

سوال: گویا ناپسندیدہ افراد کو ہٹانے کے لیے اسے ایک اچھا راستہ مل گیا۔

جواب: ہاں۔

سوال: امت شاہ کا کیا معاملہ ہے؟

جواب: وہ تو اس کا آدمی ہے۔ اس کا بہت قریبی ہے۔

سوال: میں سوچتی تھی کہ آنندی بین اس کی زیادہ سگی ہے؟

جواب: آنندی بین دایاں بازو ہے اور وہ بایاں بازو ہے۔ امت شاہ کو باہر لانے کے لیے اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ اڈوانی بھی اس سے ملنے آیا تھا۔ سشما سوراج تو اس سے ملنے اس کے گھر تک گئی۔

سوال: لیکن جب آپ گرفتار ہوئیں تو ایسا نہیں ہوا؟

جواب: کیا کریں! کوئی بات نہیں، بھگوان ہے نا۔

ایسا لگتا ہے وزیراعظم کے امیدوار کے طور پر اس کا نام پیش کیا جائے گا۔ اس کو ٹکر دینے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ آنندی بین کو وزیراعلیٰ بنا دے گا۔

سوال: یہ سب لوگ کتنا بولتے ہیں ان کے پیچھے۔ یہ آپ کے انکاؤنٹر پولیس والے بھی یہی بولتے ہیں کہ استعمال کیا اور پھینک دیا۔

جواب: ہاں۔ ونجارا بہت اچھا تھا۔ دیکھو انکاؤنٹر تو کیا ان لوگوں نے۔ لیکن انکاؤنٹر کے پس پردہ اصل وجہ کیوں سامنے نہیں آ رہی۔ جیسے سہراب الدین کو دہشت گرد بول کر مارا۔ اس کی بیوی کو کیوں مارا؟ کوثر بی تو دہشت گرد نہیں تھی نا۔ وہ بُرا آدمی تھا، تم اس کا انکاؤنٹر کر سکتے ہو لیکن اس کی بیوی کا کیوں؟

سوال: ہرین پانڈیا اور گوردھن زدافیا دونوں کو نکال دیا نا؟

جواب: گوردھن بھائی تو ٹھیک تھے۔ ہرین پانڈیا بہت متحرک آدمی تھا۔
سوال: لیکن اس نے تو گوردھن بھائی کو بھی فسادات میں استعمال کر کے پھینک دیا؟
جواب: ہاں۔ہاں۔
فسادات پورے گجرات میں ہوئے لیکن وہ لوگ نرودا کے ایم ایل اے یعنی میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔
سوال: آپ کو بلی کا بکرا بنایا؟
جواب: ہاں۔
سوال: مودی سے پوچھ گچھ میں کیا ہوا تھا؟
جواب: ایس آئی ٹی کے پاس تو وہ بھی گیا تھا لیکن اس کو چھوڑ دیا گیا۔
سوال: لیکن جس معیار کا استعمال آپ کے خلاف کیا گیا ہے اس حساب سے تو اسے بھی گرفتار ہونا چاہیے؟
جواب: (سر ہلاتی ہے)
سوال: میں کل اس سے مل رہی ہوں، آپ کے مودی سے؟
جواب: جب تم مودی سے ملو تو اس سے پوچھنا کہ وہ اتنا متنازع شخص کیوں ہے؟
سوال: واقعی؟
جواب: وہ ہر چیز کو اپنے حق میں کر لیتا ہے۔
سوال: تو کیا یہ لوگ جیل میں آپ سے ملنے آئے تھے؟
جواب: نہیں، ان میں سے کوئی نہیں آیا۔
سوال: پھر تو کسی بھی دن آپ سلاخوں کے پیچھے جا سکتی ہیں؟
جواب: ہاں۔ کسی بھی دن۔ ایک بار بس فیصلہ آ جائے۔
سوال: میں مودی سے کیا پوچھوں؟ اب تو وہ (میرے سوالات) ٹال دے گا؟

جواب: تم جب اس سے ملو تو سوال گھما پھرا کے کرنا۔ اس کی تعریف کرنا پھر اس سے پوچھنا۔۔۔

سوال: آپ کے بارے میں؟

جواب: کسی اور طرح سے پوچھنا۔ اس سے سوال کرنا کہ اس کے کچھ وزرا ملوث کیوں ہیں؟ پی سی پانڈے سے پوچھنا، وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ حقیقت سے آگاہ ہے۔ اس سے پوچھنا۔ احمد آباد کا کمشنر وہی تھا۔

سوال: تو وہ سچائی کیوں نہیں بتاتا؟

جواب: مجھے نہیں پتا۔

سوال: اب مجھے پتا چلا اس کا چہرہ لٹک کیوں گیا تھا؟ (جب میں نے کوڈنانی کے بارے پوچھا تھا)۔

جواب: میرے بارے میں بولنے کی وہ اب زحمت کیوں کرے گا۔

سوال: مودی کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

جواب: اس کی تعریف کرنا اور اس کے کام کرنے کے انداز کی تعریف کرنا پھر وہ بات کرے گا۔ تمہیں معلوم ہے وہ تم سے کیا کہے گا؟ اس کا گھسا پٹا جواب ہو گا: 'میں وویکانند سے محبت کرتا ہوں۔ میں سردار بلبھ بھائی پٹیل سے محبت کرتا ہوں۔' میرے بارے میں پوچھو تو کہے گا: 'اچھا ہم کیا کریں، ایس آئی ٹی تھی وہاں۔ فون کال کے ریکارڈ تھے۔' یا پھر اس سے بھی نپا تلا جواب دے گا: 'معاملہ عدالت میں زیر غور ہے۔'

سوال: یہ ساری باتیں تو اس پر بھی لاگو ہوتی ہیں؟

جواب: ہاہاہا۔۔۔ اُس سے یہ پوچھنا۔

سوال: ویسے۔ مجھے جینتی روی سے ملنا تھا مگر ممکن نہیں ہو پایا۔ گودھرا حادثے کے دوران وہ

وہاں پر موجود تھی؟

جواب: ارے ہاں۔ جینتی روی۔ وہ گودھرا کی کلکٹر اور انچارج افسر تھی۔ اس وقت وہ نشانے پر تھی کیوں کہ اس نے آنندی بین کو کوئی فساد نہیں کرنے دیا تھا۔ لہٰذا اب وہ سرکار کے چہیتوں کی فہرست میں شامل نہیں تھی۔ اب وہ واپس آچکی ہے۔ تفصیلات سے میں واقف نہیں ہوں۔ مزید یہ کہ تم اسے یہ مت بتانا کہ مجھے جانتی ہو یا مجھ سے مل چکی ہو۔ اس سے ملنا تو اس بات کا دھیان رکھنا کیوں کہ وہ اس بات کو دھیان میں رکھے گی۔

ان افواہوں کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ مایا کوڈنانی نے آر ایس ایس سے شکایت کی تھی کہ اس کو سزا ملی جب کہ مودی کو ایس آئی ٹی نے چھوڑ دیا۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مایا کوڈنانی نہ صرف یہ مانتی تھی کہ امت شاہ مودی کا قریبی ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شاہ کو بچانے کے لیے مودی کسی بھی حد کو پار کر سکتا ہے۔ میرے ساتھ اپنی گفتگو کے دوران اس نے انھیں باتوں پر زور دیا جنھیں میں پہلے ہی ان افسروں سے سن چکی تھی جن کا استعمال کیا گیا تھا اور اپنی سہولت کے مطابق ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا۔

گیتا جوہری

اس روز صبح سویرے مَیں نے پانی کو جگایا کیوں کہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ پانی بمشکل ۱۸ برس کی تھی اور گرین لینڈ میں کنفیکشنری شیف کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ وہ بہت ہی دلکش کپڑے پہنتی تھی۔ فاؤنڈیشن میں وہی جانِ محفل ہوتی تھی۔ جب بھی ہم 'شیلا کی جوانی' والا گانا گاتے تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھتا اور غیر شعوری طور پر رقص کرنے لگتی۔ ایک بار جب ہم احمد آباد کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو ممبئی ایئرپورٹ پر بھی وہ بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگی تھی۔ میرے دماغ میں ایک منصوبہ تھا لیکن مجھے اس بات کا یقین

نہیں تھا کہ پانی مدد کر پائے گی یا نہیں۔ اسے محض جاز موسیقی کے تازہ نغموں کا شوق تھا جسے وہ روز سنتی تھی۔

سگریٹ نوشی کی دعوت دے کر میں اس کو چھت پر لے گئی اور اس سے معلوم کیا کہ کیا ایک دن کے سفر پر وہ راجکوٹ جانا پسند کرے گی۔ میری ایک میٹنگ تھی جو ایک گھنٹے تک چلنے والی تھی جس کے لیے مجھے پانی کی مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے کہا: 'کیا ہم بس میں جائیں گے؟' اس نے پر امید ہو کر مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا 'ہاں، چھے گھنٹے کا سفر ہوگا اور ہم ایک ہوٹل میں قیام کریں گے۔' مجھے پانی کی ضرورت ایک دوسرے مقصد میں تعاون کے لیے بھی تھی۔ اس کے پاسپورٹ کی۔ احمد آباد میں تو کسی طرح میں نے رہائش کا انتظام کر لیا تھا لیکن راجکوٹ کے کسی ہوٹل کے لیے مجھے ضروری تصدیق کی حاجت ہوگی اور پانی اس سلسلے میں نہایت معاون ثابت ہوگی۔

اگلی صبح ہم لوگ راجکوٹ جانے کے لیے بس میں سوار ہو گئے۔ میں اپنے کیمرے، چپس، لیپ ٹاپ، موسیقی اور چاکلیٹ سے بھرے ہوئے پٹھو بیگ سے لیس تھی۔ بس جب تازہ دم ہونے کے لیے رکی تو پانی سیدھے لسّی کی دکان پر پہنچ گئی۔ بس مردوں سے بھری پڑی تھی۔ زیادہ تر تاجر تھے۔ اس لیے پانی نے جب سگریٹ جلایا تو اس کی طرف بہت سی نگاہیں اُٹھ گئیں۔ میں تمام راستے اس کا ہاتھ ایسے پکڑے رہی گویا غیر مطلوب توجہ سے اس کی حفاظت کر رہی ہوں۔ جب تک ہم لوٹ کر احمد آباد نہیں آگئے پانی میری ذمہ داری تھی۔ مجھے اس کے ساتھ ایک عجیب قسم کی اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔ وہ بالکل چھوٹی بہن کی طرح تھی جو مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔

جب ہم ہوٹل پہنچے تو پانی کے پاسپورٹ نے اپنا کام کر دیا۔ میتھلی کے طور پر میں نے اپنا نام درج کروایا اور جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مارے جوش کے اچھل پڑی۔ باتھ روم میں باتھ ٹب تھا۔ شیشے والی کھڑکی سے پورے شہر کا نظارہ ملتا تھا۔ وہ خوشی سے جھوم رہی تھی

اور میں گھبرائی ہوئی تھی۔ اپنے وقت کی سب سے متنازع افسر گیتا جوہری نے مجھے ملنے کا وقت دیا تھا۔ میں نے اس سے بات کرلی تھی کہ اس کی شخصیت کا خاکہ ایک کامیاب خاتون کی حیثیت سے کرنا ہے اور میں نے ایک فرضی مسودہ بھی اس کو بھیج دیا تھا۔

جب ہم جوہری سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے اپنے کمرے میں یہ کہتے ہوئے ہمارا استقبال کیا کہ وہ بڑی بے صبری سے ہماری آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ گیتا جوہری راجکوٹ کے کمشنر کے عہدے پر فائز تھی اس لیے اس کے گھر کا پتہ معلوم کرنا ہمارے لیے مشکل کام نہیں تھا۔ چند منٹوں میں ہی وہ پانی سے گھل مل گئی جس نے بڑے چاؤ سے اپنے بس کے سفر کا ذکر کیا۔ پھر جوہری نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ میں آٹھ برس گزارنے کے بعد میں تو پوری فرنگی معلوم ہونے لگی ہوں اور بولی تمہارا لہجہ بہت ثقیل ہے۔ پھر وہ اپنی بیٹی کے بارے میں باتیں کرنے لگی جو بیرون ملک رہ رہی تھی اور بتانے لگی کہ اس کے دوست اکثر وہاں آتے رہتے ہیں اور راجکوٹ میں ان کے ساتھ ہی ٹھہرتے ہیں۔ اس نے پانی کے سامنے یہ پیشکش بھی رکھی کہ اگلی بار جب وہ آئے تو اس کے گھر پر ہی قیام کرے۔ پانی فوراً راضی بھی ہوگئی۔ وقتی طور پر میں نے سر ہلا دیا۔ یہ وقت کسی اختلاف کے لیے موزوں نہیں تھا۔ میں پانی کو بعد میں وضاحت سے بتا سکتی تھی۔

اس کی بہادری کے تمام قصوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے گفتگو کا آغاز کیا اور پھر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لیکن ایک رپورٹ میں اس کے بارے میں کچھ منفی بات آئی ہے۔۔۔ اوہ۔ وہ سہراب الدین انکاؤنٹر کی بات ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں زیادہ جانکاری نہیں ہوگی۔ یہ قتل کا ایسا معاملہ ہے جس کی وجہ سے گجرات کے تمام افسران زیر نگرانی ہیں۔

اپنی آنکھیں پھاڑتے ہوئے میں نے اس سے کہا کہ ارے ہاں جس افسر سے بھی میں ملتی ہوں وہ اس معاملے میں بات کرتا ہے۔ وہ ہنس پڑی کہ کس طرح ایک 'غنڈے' نے

ریاست کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ یہ وہی گیتا جوہری ہے جس نے بقول اس کے ماتحت وی ایل سولنکی، اس اسٹیٹس رپورٹ میں تبدیلی کی مانگ کی تھی جس کو سہراب الدین فرضی انکاؤنٹر معاملے پر سپریم کورٹ میں بھیجا جانا تھا۔ امت شاہ کے گھر پر منعقد ہونے والی میٹنگ میں اس سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ رپورٹ کی تفصیلات میں تبدیلی کر دے۔ تحقیقات کو سی بی آئی کے حوالے کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے تحقیقات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی پاداش میں گیتا جوہری کو پھٹکار لگائی تھی۔

اس مناسبت سے قارئین کے لیے ضروری ہے کہ وہ گیتا جوہری کو تھوڑا اور قریب سے جان لیں۔

گیتا جوہری ۱۹۸۲ء کھیپ کی گجرات کی پہلی خاتون آئی پی ایس افسر تھی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی سے لے کر اب تک گیتا جوہری نے اپنے کیریئر گراف میں بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔ ستمبر ۱۹۹۲ء میں جوہری نے شہرت کی دنیا میں تب چھلانگ لگائی جب اس نے مافیا ڈان عبداللطیف پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اس کے دریاپور واقع پوپٹیاواڑ والے اڈے پر چھاپا مارا تھا اور بندوق بردار شریف خان کو گرفتار کر لیا تھا لیکن عبداللطیف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

۲۰۰۶ء میں جب وہ سی آئی ڈی (کرائم) کے ساتھ کام کر رہی تھی تب اس نے سہراب الدین شیخ اور اس کی بیوی کوثر بی کے فرضی انکاؤنٹر معاملے میں جاری تحقیقات کی سربراہی کی تھی۔ یہ تحقیقات سہراب الدین کے بھائی وہاب الدین کی سپریم کورٹ میں عرضی داخل کرنے کے بعد شروع ہوئی تھیں۔ اس کی مفصل اور سخت انکوائری نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ انکاؤنٹر فرضی تھا۔ انکوائری نے بہت سے پولیس افسروں کے ملوث ہونے کی بابت بھی پردہ اُٹھایا تھا اور گیتا جوہری کے ذریعہ یکجا کیے گئے ثبوتوں کی بنیاد پر ۱۳ پولیس افسروں کو گرفتار کیا گیا تھا جن میں متنازع ڈی آئی جی ڈی جی ونجارا، ایس پی راجکمار پانڈیان اور دِنیش ایم این بھی شامل تھے۔ یہ گرفتاریاں ڈی آئی جی پولیس رجنیش رائے کے

ذریعے عمل میں آئی تھیں جو رسمی طور پر تحقیقات کے انچارج تھے۔

جلد ہی رجنیش رائے کو تحقیقات چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا اور اس کی جگہ جوہری کو دوبارہ شامل کیا گیا۔ لیکن روانگی سے قبل رائے نے ان سی ڈی کو اپنے اعلیٰ افسران کے حوالے کر دیا تھا جن میں تین ملزمین کے فون کال سے متعلق ریکارڈ موجود تھے۔ جوہری نے اپنے اعلیٰ افسروں کے ساتھ بڑا تماشا کیا۔ اس کے بعد ہی اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سیدھا سپریم کورٹ کو رپورٹ کرے۔ البتہ سیشن کورٹ کے سامنے کیس سے متعلق جو چارج شیٹ اس نے داخل کی، اس کی بڑی تنقید ہوئی۔ سپریم کورٹ نے یہ حکم دے دیا کہ معاملے کو سی بی آئی کے حوالے کر دیا جائے کیوں کہ جوہری کے ذریعے معاملے کی دیکھ ریکھ میں خامیاں پائی گئی ہیں۔

فرضی انکاؤنٹر معاملے میں جوہری سب سے اہم عنصر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے قبل ایک اداراتی صفحے پر شائع اپنے مضمون میں میں نے لکھا تھا: 'کسی مثالی دنیا اور مثالی حالات میں گیتا جوہری ان عورتوں کے لیے مثالی شخصیت ثابت ہو سکتی تھی جو پولیس سروسز میں قدم رکھنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔ لیکن نہ تو یہ دنیا مثالی ہے اور نہ ہی قسمت نے گیتا جوہری کا ساتھ دیا۔'

میں نے اس کے ساتھ یہ پوچھتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز کیا کہ سب ٹھیک تو چل رہا ہے؟ کیوں کہ وہ خاصے تناؤ میں نظر آ رہی تھی۔

جواب: پچھلے چند مہینوں سے میں مشکل دور سے گزر رہی ہوں۔ بہت بُرے حالات چل رہے ہیں۔

سوال: جب ان تنازعات کا سلسلہ شروع ہوا تھا تب آپ نے ان باتوں کی توقع کی تھی؟

جواب: بعض اوقات آپ کو ایسی چیزوں کی امید نہیں ہوتی ہے۔ میں بھی توقع نہیں کر رہی تھی۔ کوئی وجہ نہیں تھی ایسی توقع کرنے کی، خاص طور پر جب آپ اچھا کام کر رہے ہوں تو آپ کسی سے یہ امید نہیں کرتے کہ وہ کوئی غلطی نکالے گا۔ لیکن چیزیں کئی

بار بعض وجوہات کی بنا پر بگڑ جاتی ہیں اور کئی بار ان کی نوعیت سیاسی ہوتی ہے۔

سوال: آپ کا معاملہ سیاسی زیادہ تھا؟

جواب: ہاں، میرا معاملہ زیادہ سیاسی تھا۔ الگ الگ حکومتیں، ریاستیں اور مرکز میں الگ الگ سرکاریں۔

سوال: میں آپ کے بارے میں بہت پڑھتی رہی ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ نے تو پارلیمنٹ کو تقریباً روک ہی دیا تھا؟

جواب: ہاہا۔ ہاں وہ سہراب الدین والے معاملے میں۔ کچھ ناخوش گوار میڈیا رپورٹیں تھیں۔ میڈیا رپورٹوں نے میرے بارے میں صرف ساری ناخوش گوار باتیں ہی کہی تھیں۔

سوال: تو آپ کہہ رہی ہیں کہ سی بی آئی کبھی بھی آپ کو گرفتار کرنا نہیں چاہتی تھی؟

جواب: نہیں۔ سی بی آئی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس زمانہ میں میں لندن میں تھی۔ میری ٹریننگ چل رہی تھی اور اس کے بارے میں سنتی رہتی تھی۔ جب میں واپس آئی تو ان ساری پریس رپورٹوں پر نظر ڈالی۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کے پاس ثبوت ہے تو اس کو پیش کیجیے۔ بس ان سے میں نے یہی مطالبہ کیا تھا۔ یہ سب کچھ ریکارڈ سے پرے ہے۔ ٹھیک ہے نا۔

بنیادی طور پر انھوں نے مجھ سے وزیر داخلہ کے بارے میں سوال کیا۔ اب چوں کہ وزیر داخلہ کے ساتھ کبھی بھی میں پورے طور پر اتفاق نہیں رکھتی تھی لہٰذا جب سی بی آئی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں امت شاہ کے ساتھ کلی طور پر کبھی اتفاق نہیں رکھتی۔ نہ کوئی آدمی، نہ ہی کوئی سیاسی لیڈر مجھ سے بات کرتا ہے کیوں کہ وہ واقعی مجھ سے ڈر گئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ گزشتہ دو برسوں سے کسی نے مجھے فون تک نہیں کیا ہے۔

سوال: کیا یہ وہی وزیر داخلہ ہے؟

جواب: ہاں، وزیر داخلہ امت شاہ۔ یہ بات گو مضحکہ خیز لگے گی لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس سے کبھی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بس مجھے دھمکی دیتے رہتے تھے۔

میرے شوہر میرے لیے حمایت کا ستون ثابت ہوئے ہیں۔ ہر اچھے بُرے اوقات میں وہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ تمام عرضیوں کا مسودہ تیار کرنے میں وہی میری مدد کرتے ہیں۔ وہ شعبہ جنگلات میں افسر ہیں اور گاندھی نگر میں قیام پذیر ہیں۔

سوال: ہر کوئی اس انکاؤنٹر کے بارے میں بات کرتا رہا ہے۔۔۔ سہراب الدین انکاؤنٹر دل چسپ کیس ہے؟

جواب: اس سے بھی زیادہ اس کی بیوی کوثر بی کے بارے میں، وہ ایک معمر خاتون تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے دو بچے تھے، دونوں بیس سے کم عمر کے، اس کی عمر ۳۵ یا ۴۰ برس رہی ہو گی۔ اس کی شادی پہلے ہی کسی اور کے ساتھ ہو چکی تھی۔ وہ اندور گئی ہوئی تھی اپنی بہن کے گھر رہنے کے لیے۔ اس کی بہن ایک بیوٹی سیلون چلاتی تھی اور وہیں سہراب الدین سے اس کو عشق ہو گیا۔ دونوں نے شادی کر لی۔ اپنے شوہر سے کوثر بی نے طلاق لے لی تھی۔

وہ ایک مجرم اور غیر قانونی ڈھنگ سے وصولی کرنے والا آدمی تھا۔

سوال: اور ایک مجرم کی وجہ سے پوری ریاست اتھل پتھل کا شکار ہو گئی؟

جواب: وہ تو تھا ہی مجرم۔ کسی انکاؤنٹر میں وہ لوگ اسے ختم کرنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے یہ کام احمقانہ طریقے سے کیا۔ انھوں نے اس کو لوگوں سے بھری بس سے اُٹھایا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ چیزیں خفیہ طریقے سے کی جاتی ہیں۔ کھلم کھلا نہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ پکڑے گئے۔

سوال: اور اسی لیے عورت کا بھی انکاؤنٹر کر دیا گیا؟

جواب: نہیں۔ کیوں کہ اس نے اس کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اس کو انکاؤنٹر میں ختم کر دیں گے۔ جب ان لوگوں نے سہراب الدین کو مارڈالا تب انھیں احساس ہوا کہ کوثر بی تو بتادے گی اس لیے ان لوگوں نے اس کو بھی مارڈالا۔ لہٰذا بنیادی طور پر مسئلہ یہ نہیں تھا کہ سہراب الدین کا انکاؤنٹر ہو گیا۔ مسئلہ تو یہ تھا کہ کوثر بی مارڈالی گئی تھی۔

سہراب الدین کا معاملہ تو صاف تھا، کوثر بی کے اہل خانہ کو بھنک لگ گئی اور وہ سپریم کورٹ چلے گئے۔

اس وقت میں سی آئی ڈی کرائم برانچ میں کام کرتی تھی۔ لہٰذا سپریم کورٹ نے اس معاملے کو ہمارے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ میں چوں کہ ایک عورت ہوں اور یہ معاملہ بھی ایک گمشدہ عورت سے متعلق تھا اس لیے یہ میرے پاس آگیا۔ لہٰذا میں اس کی تلاش میں نکل پڑی۔

جب ہماری گفتگو شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ اس کی نوعیت تو سیاسی زیادہ ہے۔ کوثر بی اور سہراب الدین کو ہر آدمی نے بھلا دیا۔

سوال: وزیر داخلہ ملوث کیوں تھا؟

جواب: کیوں کہ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا حکم غیر قانونی طریقے سے دیا گیا تھا اور غیر قانونی طریقے سے مارڈالا گیا تھا۔ سہراب الدین کو مروایا گیا اور کوثر بی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اگر آپ تحقیقات کریں تو ہر چیز صاف ہو جاتی ہے کہ ضرور یہ وزیر داخلہ کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ لیکن کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ ۱۳ پولیس افسران کو تو خود میں نے گرفتار کیا۔ یہ تعداد بہت ہوتی ہے۔ ایسا کرنا لہر کے خلاف کام کرنے جیسا تھا۔ ریاست کے خلاف کام کرنا سب سے سنگین مرحلہ ہوتا ہے۔

سوال: یعنی خود اپنے لوگوں کے خلاف کام کرنا؟

جواب: ہاں۔

سوال: لیکن سرکار نے تو آپ کے اوپر بہت دباؤ ڈالا ہوگا؟

جواب: ہاں ہر شخص نے دباؤ ڈالا۔ خود میرے اپنے رفقائے کار کا دباؤ تھا اور اندرونی تنازعات اس پر مستزاد۔ لیکن آخر کار، گرچہ کہ میں خود بھی سہراب الدین سے ہمدردی نہیں رکھتی لیکن جس طرح اس کا انکاؤنٹر کیا گیا، میں اس سے اتفاق نہیں رکھتی۔ اس کے بھی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ کو اس انداز میں کام کرنا ہوتا ہے کہ وہ قانونی معلوم ہو۔ کم از کم کاغذ کے اوپر تو آپ کو اسے قانونی اعتبار سے ٹھیک ٹھاک دکھانا ہوتا ہے۔

سوال: وہ زمانہ تو آپ کے لیے جہنم نما ہوگا؟

جواب: ہاں۔ میں بہت زیادہ قائل نہیں تھی۔ کم از کم سہراب الدین کے معاملے میں تو افسروں کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں مجھے اطمینان نہیں تھا۔ البتہ کوثر بی کے معاملے میں میں قائل تھی۔

سوال: وزیر داخلہ کو تب گرفتار نہیں کیا گیا تھا؟

جواب: نہیں۔ میں نے اس کو اس لیے گرفتار نہیں کیا تھا کیوں کہ اگر آپ اپنے ہی لوگوں کو گرفتار کرتے ہیں تو آپ کو پختہ ثبوت کے ساتھ جانا ہوتا ہے۔

سوال: لیکن سی بی آئی نے تو اس کو گرفتار کیا تھا!

جواب: سی بی آئی نے محض وزیر داخلہ اور اس کے علاوہ ایک اور افسر کو گرفتار کیا تھا۔ بقیہ ۱۳ افسر میرے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ انھوں نے کسی دوسرے کو نہ تو گرفتار کیا اور نہ ہی اس معاملے میں ایک شق کا بھی اضافہ کیا۔ انھوں نے وزیر داخلہ کو قانونی اعتبار سے کمزور ثبوت کی بنا پر گرفتار کر لیا میں نے نہیں کیا۔

بہت سے لوگ مانتے ہیں کہ جوہری جو کہ ابتدائی ایام میں اچھا کام کر رہی تھی، فرضی

انکاؤنٹر معاملے میں اس کے شوہر سے جڑے بعض کرپشن معاملوں کے راز کو افشا کر دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔(۲۳) ایک نوٹ جو سی بی آئی کو پیش کیا گیا؛ اس میں لکھا تھا کہ اس کے شوہر انل کی وجہ سے جو کہ محکمہ جنگلات کا ایک افسر ہے، جوہری نے تحقیقات کے پورے عمل کو الجھا کر امت شاہ کو کیس سے بچالیا تھا۔ لیکن یہ بات اب بھی حیرت انگیز لگتی ہے کہ ایک ایسی پولیس افسر جو کہ آٹو میں سوار ہو کر مشہور غنڈوں کے سرغنہ کے اڈّے میں گھس گئی تھی کیا اس کو بلیک میل کے ذریعے جھکنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا؟ البتہ یہ بات تو قابل فہم ہے کہ امت شاہ کو بچانے کی ایک منظم کوشش چل رہی تھی خاص طور سے اس واقعے کے بعد جب گیتا جوہری نے یہ لکھ دیا کہ سی بی آئی کی طرف سے اس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ بات اپنی کہانی آپ بتا رہی ہے۔ اتفاق سے جب سی بی آئی جوہری سے دوبارہ پوچھ گچھ کرنے والی تھی، اس سے چند دن قبل ہی راجیہ سبھا میں حزب اختلاف کے لیڈر ارون جیٹلی نے وزیر اعظم منموہن سنگھ کو ایک طویل خط لکھا۔(۲۴) یہ خط ۲۷ ستمبر ۲۰۱۳ء کو لکھا گیا تھا۔ خط کا درج ذیل اقتباس خاص طور سے دل چسپ ہے:

> آئے دن گھٹتی ہوئی اپنی مقبولیت کے پیش نظر کانگریس کی حکمت عملی صاف معلوم ہوتی ہے۔ بی جے پی اور نریندر مودی کا مقابلہ کانگریس سیاسی اعتبار سے نہیں کر سکتی ہے۔ شکست ان کے سامنے کھڑی ہے۔ تحقیقاتی ایجنسیوں کا غلط استعمال کر کے انھوں نے اب تک مختلف طریقوں سے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی، اس وقت کے وزیر داخلہ امت شاہ، گجرات کے وزیر برائے قانون، ٹرانسپورٹ اور پارلیمانی امور، بھارتیہ جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری اور دیگر اہم بی جے پی لیڈروں کو غلط ڈھنگ سے پھانسنے کی کوشش کی ہے۔

ڈی جی ونجارا جو سات برسوں سے سہراب الدین اور تلسی پرجاپتی فرضی انکاؤنٹر معاملوں میں سلاخوں کے پیچھے تھا اور بعد میں عشرت جہاں فرضی انکاؤنٹر معاملے میں بھی ملزم قرار پایا۔ اس نے ایک خط لکھ کر امت شاہ پر دھوکہ دھڑی کا الزام لگایا تھا۔(۲۵) ارون

جیٹلی کا مذکورہ بالا خط ونجارا کے ذریعے لکھے گئے خط کے محض دو ہفتے بعد ہی منظر عام پر آیا۔ ونجارا نے لکھا تھا کہ شاہ نے اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ اس کیس میں گرفتار شدہ تمام پولیس افسران جیل میں پڑے رہیں جب کہ وہ عدلیہ کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہوئے خود کو مصیبت سے دور رکھے۔ ونجارا نے اپنے خط میں گریش سنگھل جیسے افسروں کے جذبات کی عکاسی کی ہے جنھوں نے مودی اور شاہ کی جوڑی پر استعمال کرو اور پھینک دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا الزام لگایا تھا۔ وہ خط میں لکھتا ہے کہ:

> جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ حکومت نہ صرف یہ کہ ہمیں بچانے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی بلکہ خفیہ طور پر اس بات کے لیے بھی ساری کوششیں کرتی رہی ہے کہ مجھے اور میرے افسران کو جیل میں ہی رکھا جائے تاکہ ایک طرف تو سی بی آئی سے اپنی جان بچا سکیں اور دوسری طرف سیاسی مفادات بھی حاصل کرسکیں۔ سب کے علم میں یہ بات ہے کہ یہ سرکار ۱۲ برسوں سے بہت زبردست سیاسی فائدے حاصل کرتی رہی ہے۔ طریقہ یہ اختیار کیا ہوا ہے کہ گجرات کے آسمان میں انکاؤنٹر معاملوں کی لَو کو تو زندہ رکھا جائے جب کہ جیل شدہ پولیس افسران کی قسمت کے بارے میں نہ تو کوئی پروا کرے نہ ہی اس پر زیادہ کوئی بات ہو۔
>
> قابل احترام سپریم کورٹ کا پورا لحاظ کرتے ہوئے میں دل سے مانتا ہوں اور بیان کرتا ہوں کہ اگر شری امت بھائی شاہ کی تگڑم بازی، ساز باز، قانونی اور سیاسی منصوبہ بندی نہ ہوتی تو سہراب الدین انکاؤنٹر معاملے سے متعلق مقدمہ اور اس کے بعد تلسی رام پرجاپتی کا معاملہ ریاست گجرات سے باہر نہیں جاتا۔ میں بالکل واضح الفاظ میں یہ بتانا چاہوں گا کہ یہ سرکار شری امت بھائی شاہ کی گندی چال بازیوں کے ذریعے افسوس ناک طریقے سے صرف اپنے مفاد کے لیے سارا کچھ کر رہی ہے تاکہ یہ تیرتی رہے اور چوطرفہ ترقی کرتی رہے جب کہ پولیس افسروں کو ڈوبنے دیا جائے تاکہ غرقاب ہوکر وہ اپنی غیر فطری موت خود

> مر جائیں۔ اتنی طویل مدت تک باوقار طریقے سے میں صرف اور صرف اس لیے خاموش رہا کیوں کہ گجرات کے وزیر اعلیٰ شری نریندر مودی کی میں بے حد عزت کرتا تھا اور ان پر اعتماد بھی تھا۔ ان کی میں بھگوان کی طرح پوجا کرتا تھا لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ شری امت بھائی شاہ کے ابلیسی اثر اندازی کی وجہ سے میرا بھگوان ضرورت کے وقت میرے ساتھ کھڑا نہیں ہوا۔ اس نے ان کے کانوں اور آنکھوں کی صلاحیتیں ختم کردی ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ پچھلے بارہ سالوں سے بکریوں کو کتا اور کتوں کو بکری بتا کر انھیں گمراہ کر رہا ہے۔ ریاست کے نظم و نسق پر اس کی ناپاک گرفت اتنی حاوی ہے کہ پس پردہ تقریباً وہی گجرات کی سرکار کو چلا رہا ہے۔

یہ خط تمام اخباری سرخیوں میں چھا گیا کیوں کہ وہی شخص جو کبھی نریندر مودی اور امت شاہ دونوں کا نہایت قریبی ہوا کرتا تھا آج ان پر سازش رچنے کا الزام لگا رہا تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں مزید انکشاف کرے گا۔ چند ہی دنوں میں ایک اور مفرور پولیس افسر سابق ڈی جی پی پانڈے، جو عشرت جہاں معاملے میں ایک ملزم تھا، وہ بھی نمودار ہو گیا اور اس نے بھی میڈیا کے ساتھ اس موضوع پر بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔

دلّی کے اندر مرکز میں بی جے پی کو اقتدار سنبھالے چند مہینے ہی گزرے تھے کہ ڈی جی ونجارا کو ضمانت دے دی گئی اور گجرات میں ہیرو کی طرح اس کا استقبال کیا گیا۔ راجکمار پانڈیان اور ابھے چوڑاسما جیسے دیگر افسر جو سہراب الدین معاملے میں دو اہم ملزمین کے طور پر گرفتار کیے گئے تھے آج کل ضمانت پر جیل سے باہر ہیں اور گجرات پولیس کے ذریعے ان کو دوبارہ شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اسی سال سی بی آئی نے گیتا جوہری کے خلاف تمام الزامات ہٹا لیے اور اسے گجرات کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے عہدے پر ترقی دے کر پہنچا دیا گیا۔ گجرات میں تمام معاملوں میں انصاف کے پہیے واضح طور پر پیچھے کی طرف ہی چلتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔

ہرین پانڈیا

ممبئی میں رہ کر تہلکہ کے لیے رپورٹنگ کرتے ہوئے ۲۰۰۸ء میں ممبئی کے انکاؤنٹر پولیس افسر دیانایک سے میری ملاقات کئی موقعوں پر ہو چکی تھی۔ دیا ایک بڑا ہی عجیب کیرکٹر ہے۔ آخری بار میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ مجھ سے اس لیے بات نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ میں نے گجرات کے جمال صادق فرضی انکاؤنٹر معاملے میں مبینہ طور پر اس کے شامل ہونے کا تذکرہ کیا تھا۔ ایک زمانہ میں دیانایک اور پردیپ شرما دونوں ممبئی کے سب سے قد آور پولیس افسر ہوا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ فلم ساز رام گوپال ورما نے اب تک چھپن نام کی ایک فلم انھیں دونوں پولیس افسروں کی زندگی کو سامنے رکھ کر بنا ڈالی۔ ان کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ سماجی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے ان کو دیکھا جاتا تھا حتی کہ آخر کار قانون شکنی پر ان کی گرفت ہوئی۔

میڈیا میں دیا کے بہت سے دوست تھے یا یہ کہا جائے کہ وہ میڈیا کا استعمال بڑی ہوشیاری سے کرنا جانتا تھا۔ وہ بلاناغہ لوکھنڈوالا مارکیٹ میں واقع کوسٹ کیفے یا کیفے کافی ڈے میں آیا کرتا تھا جہاں اس کے جم کے احباب اکٹھا ہوتے تھے۔ نایک کو اپنی ریوالور دکھانے کا بڑا شوق تھا جو ہمیشہ اس کی جیب میں پڑی رہتی تھی۔ ۲۰۰۸ء میں اس سے ایک ملاقات کے دوران جب میں اور میری رفیق کارمکوکا (مہاراشٹر کا دہشت گردی سے متعلق سخت قانون) کے غلط استعمال کی بابت ایک سلسلے وار مضمون پر کام کر رہے تھے۔ نایک نے ایک بات کہی تھی جسے میں بھلا نہیں پائی۔ اس نے کہا تھا کہ ملک کا سب سے بڑا سیاسی قتل گجرات میں ہوا تھا جس کا تعلق مودی کے اصل حریف ہرین پانڈیا سے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس ثبوت ہے؟ تو اس کا جواب تھا کہ صحافی تم ہو، تحقیقات کرنا تمہارا کام ہے، ہم نے گفتگو کو وہیں چھوڑ دیا۔

ایک مرتبہ جب واپس اپنے گھر آگئی تو میں نے ہرین پانڈیا کے قتل سے متعلق ہر ممکن کہانی کو پڑھنے کی کوشش کی۔ جب سے مبینہ مسلم افراد کے ذریعے پانڈیا کا قتل ہوا تھا تب سے ہی شک کا ایک عنصر پایا جاتا تھا۔ پانڈیا کے والد وٹھل پانڈیا اپنی آخری سانس تک اس بات پر قائم رہے کہ اس کے بیٹے کا قتل گجرات میں اس کے سیاسی حریفوں کے ہاتھوں ہوا ہے۔ ان کی بیوی جاگرتی پانڈیا گجرات میں الیکشن بھی لڑی۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعلیٰ اور امت شاہ پانڈیا کے قتل میں ملوث تھے۔ (۲۶) لیکن ان کے دعوے کو محض غم زدہ افراد خاندان کے غصے کے اظہار کے طور پر ہی لیا گیا۔

اس سلسلے کی بس ایک کہانی جو واضح طور پر میری یادداشت میں محفوظ ہے اتفاق سے ایک تفتیشی رپورٹ پر مبنی ہے جو سینئر صحافی سنکرشن ٹھاکر نے لکھی تھی۔ سنکرشن کے شان دار رپورتاژ سے بہت سے انکشافات کا مختصر خاکہ میں یہاں پیش کرتی ہوں۔

واحد چشم دید گواہ یادرام کا کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا، اس سے اس قدر حواس باختہ ہوا کہ ایک گھنٹے تک اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا۔ اور جب وہ حرکت میں آیا تو اس نے پولیس کو نہیں بلکہ اپنے سیٹھ کو آگاہ کیا جو ایک مقامی تاجر ہے اور سنیہل ادن والا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ادن والا نے بھی پولیس کو اطلاع نہیں دی جب کہ اس کو پتہ تھا کہ جو آدمی لاء گارڈن کے پارکنگ والے حصہ میں کھڑی ماروتی ۸۰۰ میں مردہ پڑا ہوا ہے وہ ہرین پانڈیا ہے۔ وہ پانڈیا کے ساتھی پرکاش شاہ کو بلاتا ہے اور اسے بتاتا ہے۔ شاہ بھی پولیس کو خبر نہیں دیتا ہے۔ وہ پانڈیا کے سکریٹری نلیش بھٹ کو بلاتا ہے جو پانڈیا کے گھر پر ہی موجود ہوتا ہے اور پہلے ہی سے فکر مند رہتا ہے کہ اس کے باس کو واپس آنے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ تب جا کر بھٹ جلدی سے لاء گارڈن میں پہنچتا ہے، کار کو تلاش کرتا ہے اور اس کو کھول کر دیکھتا ہے تو پاتا ہے کہ اس کے باس پر پے در پے گولیاں چلائی گئی ہیں۔ یہ واقعہ دس بجے کے کچھ ہی بعد کا ہے۔ گجرات کا سابق وزیر داخلہ پچھلے دو گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک شہر کے

پیچوں پیچ کار میں مردہ پڑا رہتا ہے۔

دریں اثنا ایلس برج پولیس تھانے کو کنٹرول روم سے دوسرا فون آتا ہے کہ پتہ لگاؤ کہ لاء گارڈن میں کیا ہو رہا ہے۔ ہلچل ہو رہی ہے۔ افواہیں پھیل رہی ہیں۔ اب ایک دوسرا سب انسپکٹر وائی اے شیخ باہر نکل کر جاتا ہے۔ لاء گارڈن کی طرف جاتے ہوئے آدھے راستے میں ہی شیخ کے پاس کنٹرول روم سے دوبارہ فون آتا ہے کہ لاء گارڈن نہیں بلکہ وہ پریمل گارڈن کا رخ کرے۔ وہ راستہ بدل دیتا ہے۔ ۱۰ بج کر ۵۰ منٹ پر اس کو ایک اور فون موصول ہوتا ہے۔ اس وقت اسے لاء گارڈن جانے کو کہا جاتا ہے۔ وہ ۱۰ بج کر ۵۴ منٹ پر وہاں پہنچتا ہے۔ پانڈیا کو گولی مارے جانے کے لگ بھگ تین گھنٹے کے بعد اندازہ لگایئے کیا ہوا ہوگا؟ شیخ کا رفیق کار سب انسپکٹر نایک جو اس سے پہلے لاء گارڈن کے لیے نکلا تھا اب تک موقع واردات پر نہیں پہنچا تھا۔ اس صبح مقامی پولیس کو احکامات کہاں سے مل رہے تھے؟ موقع واردات جس کی دوری دس منٹ سے زیادہ نہیں ہے وہاں تک پہنچنے میں اتنی تاخیر کیوں ہو رہی تھی؟

اسی دن دوپہر کو وی ایس اسپتال میں کیے گئے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلا کہ پانڈیا کے جسم پر گولیوں کے سات زخم تھے جب کہ اسے پانچ گولیاں لگی تھیں۔ ان میں سے پانچ زخموں کی لمبائی اعشاریہ آٹھ سینٹی میٹر تھی جب کہ دو زخم نصف سینٹی میٹر کے تھے۔ سائنٹفک اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ سطح کے کھنچاؤ اور رکاوٹ کی وجہ سے ایک ہی پستول الگ الگ سائز کے زخم بنادے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ پانچ گولیاں ہی سات زخم بنادیں کیوں کہ گولیاں جسم کے آرپار ہو سکتی ہیں۔ لیکن جن آزاد ماہرین نے معاملے کی چھان بین قریب سے کی ان کا ماننا ہے کہ اس کیس میں ایسا ہونے کا امکان بہت کم ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ دو گولیوں کا پتہ ہی نہیں لگایا جاسکا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جس گولی نے زخم نمبر ۵ لگایا تھا وہ پانڈیا کے فوطہ پر چلائی گئی تھی جو اوپر چڑھتی ہوئی پیٹ کی پرت کو پھاڑتے ہوئے اس کے سینے تک پہنچ گئی

تھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا آدمی جو کار میں بیٹھا ہو، وہ بھی پانڈیا جیسا چھ فٹ سے بھی زیادہ لمبا بھاری ڈیل ڈول کا آدمی، اس پر سے ماروتی ۸۰۰ میں، اس پر فوطہ کے راستے سے گولی ماری جائے؟ کوئی بھی آدمی جس کے فوطہ پر گولی ماری جائے گی، جیسا کہ پانڈیا کے ساتھ ہوا، اس کا خون بہت بہے گا۔ فوطہ خون کی نالیوں کے پیچیدہ جال کا نام ہے جو جسم کی حرارت کو کنٹرول کرتا ہے۔ کیا پانڈیا کا خون بہا تھا؟ ہاں، لیکن کیا کار میں اس کے نشانات ہیں؟ نہیں۔ پانڈیا کے فوطہ اور گردن میں گولی ماری گئی تھی، دو گولیاں اس کے سینے کے آرپار گئی تھیں اور ایک گولی اس کے بازو سے ہو کر گزر گئی تھی۔ کار کو تو خون میں لت پت ہو جانا چاہیے تھا۔ کم سے کم اس کی سیٹ تو خون سے ڈوبی ہی چاہیے تھی۔ پھر بھی فارنسک رپورٹوں کو گاڑی میں خون کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ صرف آگے والی پسنجر سیٹ پر ہلکا سا دھبہ تھا اور دوسرا چابی کی چین پر۔ (سنٹرل فارنسک سائنسز لیباریٹری، رپورٹ نمبر سی ایف ایس ایل ۲۰۰۳/ایف۔ ۲۳۲)

فارنسک رپورٹوں نے پانڈیا کی کار میں گولی کے باقی ماندہ حصے کی موجودگی کو بھی ریکارڈ نہیں کیا تھا (موبائل فارنسک سائنس لیباریٹری ریاست گجرات کی رپورٹ) اگر زیادہ نہیں تو پانچ گولیاں اس پر چلائی گئیں تھیں۔ بظاہر تب جب وہ کار میں بیٹھا تھا۔ پھر بھی گولی کا باقی ماندہ حصہ غائب؟

ہرین پانڈیا کو گولی اس کی کار میں ماری بھی گئی تھی یا نہیں؟ یا قتل کہیں اور ہوا اور بعد میں اس کے جسم کو کار میں ڈال دیا گیا تھا؟ اس صبح پانڈیا گھر سے نکل کر کہاں کہاں گیا تھا؟ کچھ سراغ موجود ہیں جن کے ذریعے پتہ لگانے میں مدد مل سکے، لیکن وہ سراغ یا تو ہوا ہو گئے ہیں یا دستیاب نہیں ہیں۔

جب لاء گارڈن سے پانڈیا کے جسم کو نکالا گیا تب وہ جوتے پہنے ہوئے تھا۔ لیکن جب پوسٹ مارٹم کے لیے اسے لے جایا گیا تب جوتے غائب تھے۔ ان جوتوں کا کوئی ریکارڈ نہیں

ہے۔ جوتوں میں اہم سراغ ہو سکتے تھے جن کے ذریعہ پتہ چل سکتا تھا کہ اس صبح پانڈیا کہاں گیا تھا۔

پانڈیا کا سرمئی رنگ والا لیپ ٹاپ اور سیمسنگ موبائل پولیس کو کار سے برآمد ہوا تھا۔ یا تو پولیس نے اس کو چیک کرنے کی زحمت نہیں کی یا پھر پانڈیا کے فون سے حاصل شدہ کال ڈاٹا ریکارڈ کو چھپا رہی ہے جو اس دن کیے گئے تھے۔ ان ریکارڈس کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا کہ پانڈیا نے کس کو کال کی تھی، کن لوگوں نے اس کو کال کیے تھے۔ ایک بار پھر حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ ریکارڈس اہم ذریعہ ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ ریکارڈس موجود ہی نہیں ہیں۔ جب پانڈیا کو خدمات مہیا کرانے والی کمپنی ہچ سے ریکارڈ مانگے گئے تو اس نے جنوری اور فروری ۲۰۰۲ء کی فہرستیں پیش کی لیکن مارچ ۲۰۰۳ء کے ریکارڈ مانگے جانے پر ہچ نے ایک عجیب بہانہ کیا کہ وہ بہت پرانے ہیں۔ لیکن لازمی بات تو یہ ہے کہ جنوری اور فروری تو مارچ سے پہلے ہی آتے ہیں۔

ہرین پانڈیا قتل معاملے کا ایک ملزم مفتی سفیان کا عجیب وغریب کیس کیا اس خاکے کا حصہ ہو سکتا ہے؟ سفیان ایک نوجوان عالم ہے جس نے احمد آباد کی لال مسجد میں اپنی آتش بیانی کی وجہ سے اپنے لیے جلد ہی ایک نام پیدا کر لیا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ ۲۰۰۲ء کے تشدد کے بعد سے وہ زیادہ متشدد ہو گیا تھا اور نماز کے بعد اپنے خطبوں کے دوران جوابی طور پر فرقہ واریت کی چنگاری کو ہوا دیتا تھا۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ احمد آباد کے ان مافیاؤں سے اس کے تعلقات تھے جن کا گزر بسر شراب کے ناجائز دھندے سے چلتا تھا۔ سفیان پر الزام ہے کہ پانڈیا کو ٹھکانے لگانے کے لیے اصغر علی سے سانٹھ گانٹھ کرنے میں اس نے اپنا رول ادا کیا ہے۔ قتل کے ایک ہفتے کے اندر، جب کہ بظاہر اس پر نظر رکھی جا رہی تھی، سفیان ملک سے فرار ہو گیا۔ کہاں گیا؟ کسی کو خبر نہیں، بنگلہ دیش، پاکستان، افغانستان یا پھر یمن۔ کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ سی بی آئی نے اپنی ویب سائٹ پر سفیان کو اشتہاری مجرموں کی تصاویر

والے البم میں شناخت کی غرض سے ڈال دیا اور انٹرپول سے اس کے خلاف ریڈ کارنر نوٹس بھی لگوا دیا۔ کاغذ پر وہ ایک مطلوب شخص تھا جس پر پانڈیا کے قتل کا منصوبہ بنانے کا الزام تھا۔ اس کے باوجود اس کے خفیہ طور پر غائب ہونے کے ایک سال یا اس کے کچھ بعد اس کی بیوی اور بچے بھی غائب ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ایک اعلیٰ افسر کے بقول 'ان کو سخت پہرے میں رکھا جانا چاہیے تھا کیوں کہ سفیان کی پناہ گاہوں کا پتہ لگانے کے لیے اس کی بیوی اور بچے آخری سراغ تھے۔' لیکن پھر بھی وہ نکل گئے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ کیا کسی نے باہر نکلنے میں ان کی مدد کی؟ کیا سفیان کے پاس کچھ خاص راز تھے؟

کیا کوئی سودا ہوا تھا؟

۲۰۱۰ء میں پہلی بار میری ملاقات جاگروتی پانڈیا سے ہوئی، یہ واقعہ میری خفیہ تحقیقات کے آغاز سے ذرا پہلے کا ہے۔ میں سہراب الدین انکاؤنٹر کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی کہ ایک دن اس کو ٹی وی پر دیکھا۔ وہ پُرجوش انداز میں اپنے شوہر کے قتل کی منصفانہ تحقیقات کا مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور والد کے ساتھ احمد آباد کے اعلیٰ متوسط طبقے والے علاقے میں رہتی تھی۔ بعد میں ان کو میں جاگرتی بین یا جاگروتی جی کہہ کر بلانے لگی۔ وہ بہت بہادر خاتون ہیں۔ آج میں ان کو عزیز دوست کہہ سکتی ہوں۔ اپنے شوہر کے قاتلوں کو تلاش کرنے میں ان کی جرأت مندانہ کوشش قابل ستائش ہے۔ ہرین پانڈیا آر ایس ایس، اڈوانی اور بہت سے بی جے پی لیڈروں کا چہیتا ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے مختلف پولیس افسران بھی اس کو عزیز رکھتے تھے۔ گجرات فسادات میں اس کا کردار گو مبینہ طور پر مشکوک تھا لیکن ایسا مانا جاتا ہے کہ مسلم برادری کے بہت سے لوگ بھی اس کو پسند کرتے تھے۔

جاگروتی مسلمانوں سے متنفر تھی کیوں کہ انھیں میں سے ایک شخص نے مبینہ طور پر اس کے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔ قسمت کا کرشمہ دیکھیے کہ ان کو یہ لگا کہ رعنا کوئی ہندو نام ہے۔

ان کی تصحیح کرتے ہوئے مجھے بہت پشیمانی ہوئی تھی اور میں نے فیصلہ کیا کہ ان کو اپنے عقیدہ کے بارے میں دریافت کرنے کا موقع دوں گی۔ بعد میں میرے ایک اخباری کالم کے ذریعے میرے خاندانی نام کے بارے میں ان کو معلوم ہو گیا۔ وہ جب اپنے شوہر کے قاتلوں کے بارے میں بات کرتیں تو کبھی مسلمانوں کو 'یہ لوگ' کہہ کر اشارہ کرتیں اور کبھی ان کو 'تشدد پسند ٹولا' کے نام سے بلاتیں۔ جاگروتی سے ملاقات کے بعد اس کا یہ اعتقاد سن کر کہ مسلم لڑکوں کو کوئی طاقت ور شخص استعمال کر رہا ہے میں حیران رہ گئی۔ میرے سامنے ایک ایسی عورت بیٹھی تھی جس نے آٹھ برس پہلے اپنا شوہر کھویا تھا۔ اس کے چھوٹے بیٹے کو اپنے باپ کی آخری رسومات کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ اس عورت نے اس بات کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ کہ اس کے بیٹوں کو ایک مہذب پرورش نصیب ہو انصاف کی خاطر کوشش کرنا نہیں چھوڑا۔ اس نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اس کے بچوں پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ اس کا چھوٹا بیٹا ریاستی سطح کا کھلاڑی تھا اور اس کا بڑا بیٹا ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ دونوں بیٹے چٹان کی طرح اپنی ماں کے ساتھ کھڑے تھے۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے والد کے قتل کے پیچھے بڑی سازش کار فرما تھی، ان کے اس یقین پر کبھی کسی نے شک کی انگلی نہیں اٹھائی۔ اپنے شوہر کی موت کے تعلق سے جاگروتی کے پاس کچھ جائز سوالات تھے جو ان کال ریکارڈس پر مبنی تھے جو اس نے مجھے دیے۔ اس کے علاوہ ان تفصیلات پر بھی مبنی تھے جو مفتی سفیان اور اس کے اہل خانہ نے فراہم کیے تھے۔ جاگروتی نے سفیان اور اس کے اہل خانہ سے ملنے کی کوشش بھی کی تھی۔(۲۷)

جاگروتی نے مجھے سنکرشن ٹھاکر کی مفصل رپورٹ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اقتباسات پیش کیے گئے ہیں) بھی دکھائی تھی۔ اس سے میری ملاقات امت شاہ کے جیل جانے کے فوراً بعد ہوئی تھی اور تب تک تفصیلات سامنے آنے لگی تھیں کہ تلسی پرجاپتی (اسے بھی فرضی انکاؤنٹر میں مار ڈالا گیا تھا) کے پاس پانڈیا قتل کے بارے میں اہم معلومات

ہیں۔ اپنی خفیہ تحقیقات کی انجام دہی کے مہینوں بعد جب میں دہلی لوٹ کر آئی تو اکتوبر ۲۰۱۱ء میں میں نے پانڈیا کے قتل کے بارے میں ایک مضمون لکھا اور اس میں کچھ اہم سوالات اٹھائے۔

سفیان کا باپ چوڑاسما کی تعریف کیوں کرتا ہے جو اس وقت احمد آباد کرائم برانچ میں کام کرتا تھا؟ اگر سفیان کی فیملی کی بات مان لی جائے تو چوڑاسما نے اس کے اہل خانہ سے وعدہ کیوں کیا تھا کہ ان پر کوئی آنچ نہیں آئے گی؟ جب کہ سی بی آئی، جس کو ابتدائی تحقیقات کی ذمہ داری کرائم برانچ کے ذریعے سونپی گئی تھی، کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایک منطقی سوال اٹھتا ہے کہ معاملے کی تحقیقات کرنے والی سی بی آئی ٹیم سفیان کا پتہ لگانے کے لیے استغاثہ کیوں نہیں بھیج پائی؟

دوسرا نقطہ یہ ہے کہ سی بی آئی تحقیقات کے افسر کا دعویٰ ہے کہ پانڈیا کے مارچ ۲۰۰۳ء کے فون ریکارڈ حاصل نہیں کیے جاسکے۔ جب کہ مارچ سے دو مہینے پہلے تک کے ریکارڈ سونپ دیے گئے ہیں۔ ان ریکارڈس سے پتہ چلتا ہے (جس کا ایک نسخہ تہلکہ کے پاس موجود ہے) کہ احمد آباد کی ایک خاتون صحافی نے ۴۰ فون کالس کی تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ نہ تو سی بی آئی نے اور نہ ہی پولیس نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایک اہم گواہ انل یادو رام جولاء گارڈن کے پاس اشیائے خوردنی کا ٹھیلہ لگاتا ہے اور جس نے مبینہ طور پر قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اس نے متضاد بیانات دیے ہیں۔ پہلے اس نے پولیس سے کہا کہ وہ اتنا حواس باختہ ہو گیا تھا کہ کچھ رد عمل نہیں کر سکا۔ لیکن ایک گھنٹے کے بعد اس نے اپنے ٹھیلے کے مالک کو بلایا پھر اس نے پانڈیا کے ساتھی کو بلایا لیکن پولیس کو بلانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جب تہلکہ نے یادرام سے ملاقات کی تو اس نے تین دنوں میں تین متضاد بیانات دیے۔ پہلے دن اس نے کہا کہ علی موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ دوسرے دن اس نے کہا کہ اُس نے اسے کار کی طرف چل کر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور تیسرے دن کہا کہ واقعات کی کڑی

ان کی تصحیح کرتے ہوئے مجھے بہت پشیمانی ہوئی تھی اور میں نے فیصلہ کیا کہ ان کو اپنے عقیدہ کے بارے میں دریافت کرنے کا موقع دوں گی۔ بعد میں میرے ایک اخباری کالم کے ذریعے میرے خاندانی نام کے بارے میں ان کو معلوم ہو گیا۔ وہ جب اپنے شوہر کے قاتلوں کے بارے میں بات کرتیں تو کبھی مسلمانوں کو 'یہ لوگ' کہہ کر اشارہ کرتیں اور کبھی ان کو 'تشدد پسند ٹولا' کے نام سے بلاتیں۔ جاگروتی سے ملاقات کے بعد اس کا یہ اعتقاد سن کر کہ مسلم لڑکوں کو کوئی طاقت ور شخص استعمال کر رہا ہے میں حیران رہ گئی۔ میرے سامنے ایک ایسی عورت بیٹھی تھی جس نے آٹھ برس پہلے اپنا شوہر کھویا تھا۔ اس کے چھوٹے بیٹے کو اپنے باپ کی آخری رسومات کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ اس عورت نے اس بات کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ کہ اس کے بیٹوں کو ایک مہذب پرورش نصیب ہو انصاف کی خاطر کوشش کرنا نہیں چھوڑا۔ اس نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اس کے بچوں پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ اس کا چھوٹا بیٹا ریاستی سطح کا کھلاڑی تھا اور اس کا بڑا بیٹا ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ دونوں بیٹے چٹان کی طرح اپنی ماں کے ساتھ کھڑے تھے۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے والد کے قتل کے پیچھے بڑی سازش کار فرما تھی، ان کے اس یقین پر کبھی کسی نے شک کی انگلی نہیں اٹھائی۔ اپنے شوہر کی موت کے تعلق سے جاگروتی کے پاس کچھ جائز سوالات تھے جو ان کال ریکارڈس پر مبنی تھے جو اس نے مجھے دیے۔ اس کے علاوہ ان تفصیلات پر بھی مبنی تھے جو مفتی سفیان اور اس کے اہل خانہ نے فراہم کیے تھے۔ جاگروتی نے سفیان اور اس کے اہل خانہ سے ملنے کی کوشش بھی کی تھی۔(۲۷)

جاگروتی نے مجھے سنکرشن ٹھاکر کی مفصل رپورٹ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اقتباسات پیش کیے گئے ہیں) بھی دکھائی تھی۔ اس سے میری ملاقات امت شاہ کے جیل جانے کے فوراً بعد ہوئی تھی اور تب تک تفصیلات سامنے آنے لگی تھیں کہ تلسی پرجاپتی (اسے بھی فرضی انکاؤنٹر میں مار ڈالا گیا تھا) کے پاس پانڈیا قتل کے بارے میں اہم معلومات

اُسے یاد نہیں۔ چوتھا نقطہ یہ ہے کہ فارنسک رپورٹ کے مطابق پانڈیا کے کرتے میں چھ سوراخ تھے، لیکن اس کے جسم میں صرف پانچ گولیاں ملی تھیں۔ اگر وہ اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھا تھا اور ہتھیار دائیں کھڑکی کی طرف سے چلایا گیا تھا جو کھلا ہوا حصہ تھا تو فوطہ میں کوئی زخم نہیں آنا چاہیے تھا۔ استغاثہ نے وضاحت کر دی اور جج صاحب نے مان لیا کہ وہ پہلو کے بل پسنجر والی سیٹ پر گر گیا تھا لیکن ایسا ہونا ناممکن ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ پولیس کنٹرول روم کے رجسٹر میں درج ایک ایف آئی آر سے بدحواسی اور تاخیر کا پتہ چلتا ہے۔ ان خامیوں اور گواہوں کے بدلتے موقف کے مدنظر یہ بالکل فطری بات تھی کہ گزشتہ مہینے حیرت انگیز طور پر ہائی کورٹ اس معاملے سے جڑے تمام ۱۲ ملزمین کو بَری کر دے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے کہ شواہد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ علی نے پانڈیا کو گولی مار کر قتل کیا تھا۔

اس کے بعد کئی موقعوں پر جاگروتی سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم کبھی گاڑی چلاتے ہوئے دور نکل جاتے اور کبھی کھانا کھانے کے لیے باہر جاتے۔ اس کو ایک رازدار مل گیا تھا اور مجھے ایک ایسا دوست جس سے سچائی کو بے نقاب کرنے میں بہت مدد ملی۔ مجھے یاد ہے ایک بار جاگروتی سے میں اس وقت ملی جب اس کے شوہر کے قتل سے متعلق معاملے میں چارج شیٹ داخل کروانا تھی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور میں روزے سے تھی۔ جیسے ہی میں اس کے گھر میں داخل ہوئی اس نے مجھے لیمو پانی پیش کیا۔ میں نے نہ پینے کا بہانہ کیا تو اس نے چائے کی پیشکش کر دی۔ تب میں نے اسے بتایا کہ 'جاگروتی بین، رمضان ہے اور میرا روزہ ہے اس لیے میں کچھ کھاپی نہیں سکتی۔' وہ یہ سن کر حیران رہ گئی اور کسی طرح چند الفاظ جوڑ کر کر پوچھا: 'آپ محمڈن ہو؟ مجھے پتا نہیں تھا۔' وہ یہ سوچ کر شرمندہ ہو رہی تھی کہ میرے سامنے کتنی بار اس نے میری قوم کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے تھے۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا کہ کوئی بات نہیں، آپ کی جگہ میں ہوتی تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتی۔ آپ کے ساتھ جو ہوا ہے وہ کوئی معاف نہیں کر سکتا۔

میرے ساتھ بیٹھ کر چارج شیٹ کے صفحات کو غور سے پڑھا پھر کال ریکارڈس پر غور کیا اور بڑی تندہی سے میرے سوالات کے جوابات بھی دیے۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کے شوہر کو وی آر کرشنا ایئر کے زیر قیادت ۲۰۰۲ء گجرات قتل عام کی انکوائری کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اگرچہ انکوائری کے سامنے پیشی کا انتظام خفیہ طور پر کیا گیا تھا لیکن جاگروتی کا ماننا ہے کہ مودی کو اس پیشی کے بارے میں پتہ لگ گیا تھا۔ جاگروتی کے مطابق ہرین کے ساتھ مودی کے وقار سے جڑے کئی معاملے تھے۔ لہٰذا جاگروتی زور دے کر کہتی ہے کہ اسی وجہ سے مودی نے بی جے پی کی اعلیٰ کمان کی بات نہ مانتے ہوئے اس کے شوہر کو ایلس برج حلقہ انتخاب کی سیٹ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پانڈیا نریندر مودی کے لیے ایک سیاسی کانٹا بن چکا تھا کیوں کہ ہمیشہ آر ایس ایس کے یہاں اس کی پذیرائی ہوتی تھی اور ہرین کو سنگھ کی حمایت ہمیشہ حاصل رہتی تھی۔

میں روانگی کے لیے تیار ہونے لگی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں احمد آباد میں کہاں ٹھہری ہوں۔ اسی دن شام کو تقریباً ساڑھے چھ بجے افطار سے ۳۰ منٹ قبل اس نے مجھے بلایا۔ وہ میرے ہوٹل کے باہر میرا انتظار کر رہی تھی تا کہ مجھے کسی ریستوران میں لے جائے جہاں میں اپنا روزہ کھول سکوں۔

اس دن کے بعد سے جاگروتی میرے تحفظ کا بہت خیال رکھنے لگی۔ وہ کہتی تھی کہ اس ریاست کو وہ جانتی ہے۔ میرے شوہر کے بارے میں حقیقت کو بے نقاب کرنے کی خاطر تم اتنی سخت محنت کر رہی ہو تو یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں تمہاری حفاظت کروں خاص طور پر جب تمہارے ساتھ ایک مسلم نام جڑا ہوا ہے۔

ہرین پانڈیا کی تفتیش کے سلسلے میں بہت سے افسر مامور تھے۔ قتل کے چند ہی دنوں میں سی بی آئی نے معاملے کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور پروٹوکول کے مطابق ایف آئی آر تیار کر کے گجرات پولیس سے دستخط کروا لیے تھے۔ میں نے ایف آئی آر کا بغور مطالعہ کیا۔ تحقیق

کار افسر ایک انسپکٹر تھا اور اس کا نام وائی اے شیخ تھا۔ (اوپر کی نیوز رپورٹ میں اس کا ذکر آچکا ہے)۔

اتفاق سے وہ وی ایل سولنکی کا دوست تھا (جس کا ذکر گیتا جوہری کے تعلق سے پہلے آچکا ہے)۔

شیخ ملاقاتیوں سے نہیں ملتا تھا اور میڈیا کے لوگوں سے تو بالکل بھی نہیں۔ میں نے ابھی اپنی خفیہ تحقیقات کا آغاز نہیں کیا تھا اور شاہ کی گرفتاری کے بعد احمد آباد میں ہی موجود تھی۔ میں دو بار وی ایل سولنکی سے ملی جس نے میرے پس منظر کی تفتیش (بیک گراؤنڈ چیک) کرانے کے بعد مجھے اپنے گھر پر ملنے کی اجازت دے دی۔ اس کے گھر کے باہر ایک پولیس جیپ تھی جس میں پولیس کانسٹیبل موجود تھے۔ یہ پولیس کانسٹیبل سولنکی کو اضافی سیکورٹی مہیا کر رہے تھے۔ یہ انتظام گیتا جوہری کے خلاف اس کے بیان کے بعد کیا گیا تھا۔

سولنکی سی بی آئی کو دیے گئے اپنے ہر لفظ پر قائم رہا۔ روانگی سے ذرا قبل میں نے سولنکی سے یوں ہی پوچھ لیا کہ کیا وہ کسی شیخ نامی افسر کو جانتا ہے؟ اس نے فوراً پوچھا: 'تم اس سے ملنا یا اس کے بارے میں جاننا کیوں چاہتی ہو؟' میں نے نرمی سے جواب دیا: 'سوچا کہ کیس کے بارے میں اس سے مل لوں۔' وہ مسکرا دیا اور گھر سے باہر تک چھوڑنے کے لیے آتے ہوئے بولا: 'رہنے دو بین۔ وہ نہیں ملے گا آپ سے۔ اور آپ ان سب میں نہ پڑو۔'

شیخ اپنے رفقائے کار اور ریاست سے ڈرا ہوا تھا کیوں کہ اس نے پانڈیا معاملہ میں ایف آئی آر درج کی تھی۔ سی بی آئی کو معاملہ منتقل کیے جانے سے قبل وہی معاملے کی تحقیقات کر رہا تھا۔ سی بی آئی کے حوالے یہ معاملہ تب کیا گیا جب پانڈیان کے والد نے شکایت کی کہ کیس سے جڑی کچھ باتیں دبائی جا رہی ہیں۔

گجرات کا ایک وکیل تھا جو شیخ کو اچھی طرح سے جانتا تھا اور جس کے پاس شیخ اکثر مشورے کے لیے جایا کرتا تھا۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ شیخ کے ساتھ ایک ملاقات

کروادے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ضرورت پڑے تو مذہب کا کارڈ بھی استعمال کر دیں اور کہہ دیں کہ میں ایک مسلم لڑکی ہوں اور اس جیسے افسروں سے ہمدردی رکھتی ہوں جو موجودہ ٹولی کے تحت کام کرنے میں گھٹن محسوس کرتے ہیں۔

ان دنوں میں خان پور میں واقع ایمبسڈر ہوٹل میں رہ رہی تھی۔ خان پور ایک مسلم اکثریتی والا علاقہ ہے۔ ہر صبح اور شام کو مقامی مسجد سے آنے والی اذان کی آواز کی وجہ سے رمضان کے مہینے میں مجھے اپنی سحری اور افطار کرنے میں مدد مل جاتی تھی۔ ایمبسڈر کا مالک ایک سندھی تاجر تھا۔ ایمبسڈر کے ٹھیک سامنے ایک ریستوران ہوا کرتا تھا جس کو ایک مسلمان چلاتا تھا۔ وہاں مسلمان روزہ کھولنے کے بعد چائے اور مٹھائیاں کھانے آتے تھے۔

اسی جگہ شیخ پہلی ملاقات کے لیے راضی ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور اس کو بتایا کہ میں وہی صحافی ہوں جس نے سہراب الدین اور تلسی پرجاپتی معاملوں میں ثبوت فراہم کیے تھے اور امت شاہ کو سلاخوں کے پیچھے بھجوایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ پورا گجرات رعنا ایوب نامی مرد کو جانتا ہے۔ میں ہنس پڑی۔

شیخ بہت سراسیمہ لگ رہا تھا۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ میں ایک پکی باعمل مسلمان ہوں اور فسادات کے مہلوکین سے گہری ہمدردی رکھتی ہوں۔ اس نے دبے لفظوں میں جواب دیا: 'آپ تہلکہ والے ہو۔ ڈر لگتا ہے آپ لوگوں سے بات کرنا۔ پتا نہیں کیا ریکارڈ کر لو۔'

میں نے کہا کہ میری ڈائری اور میرا بیگ چیک کر لیں۔ یہ سن کر وہ پشیمان ہو گیا اور ہنس پڑا۔ میں نے اس سے دوبارہ ملنے کی پیشکش کی لیکن پورے ایک ہفتے تک اس سے رابطہ کرنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔

یہ عمل کارگر ثابت ہوا۔ دوسرے ہفتے میں شیخ سے پھر ملی۔ لیکن اس بار اس کا بھروسا توڑنے کے لیے۔ ایسا کرنے کی وجہ سے میں اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ احساس پشیمانی سے

میر ادم گھٹ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں۔ میں رعنا ایوب صحافی ہوں جسے تمام معلومات پردۂ راز میں رکھنی ہیں۔ لیکن میرے سامنے ایسا شخص تھا جس کے بارے میں امکان تھا کہ وہ سچائی جانتا ہے۔ پانڈیا کے قتل کو دس سال ہو گئے تھے پھر بھی کیس میں کسی پیش رفت کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اپنا جاسوسی کیمرہ اپنے ساتھ لے چلتی ہوں اور اس کی گفتگو ریکارڈ کروں گی لیکن اسے تب ہی استعمال کروں گی جب میرے ہاتھ کچھ اور نہیں لگے گا۔ شیخ سے ملاقات کے بعد میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا سراغ ہی مل جائے۔ یہاں تک کہ مفتی سفیان کے گھر بھی گئی لیکن وہ بس پولیس کی تعریف کے پُل باندھتے رہتے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان کو خوب اچھی طرح سبق رٹا دیا گیا تھا۔

اگلی بار جب ہم ملے تو شیخ کھل کر بولا۔

شیخ: اس سے پہلے کہ میں آغاز کروں میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں، آئی بی کے ذریعہ تم پر نگاہ رکھی جارہی ہے۔ وہ بھی آئی بی کی اعلیٰ ترین اتھارٹی کے ذریعہ۔

سوال: ریاستی آئی بی یا مرکزی آئی بی؟

جواب: ریاستی آئی بی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کو معلوم ہے کہ تم مجھ سے ملی تھی اور ان لوگوں نے مجھے محتاط رہنے کو کہا ہے۔ یہ ان کا کام ہے۔ اس لیے میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم بھی محتاط رہو۔

سوال: لیکن وہ میرے خلاف کیوں ہوں گے؟

جواب: تم جانتی ہو کہ یہ ہرین پانڈیا کا معاملہ آتش فشاں پہاڑ جیسا ہے۔ ایک بار سچائی باہر آجائے تو مودی کی گھر واپسی ہو جائے گی۔ اس کو گھر بھی نہیں بلکہ اس کو جیل جانا پڑے گا۔ وہ قید خانے میں ہو گا۔ دیکھو، ابھی دو دن نہیں گزرے کہ جاگروتی پانڈیا نے اپیل کی کہ ہرین پانڈیا معاملے میں اعظم خان کے بیان پر غور کیا جائے اور اس سے پہلے کہ اعظم خان کے بیان پر کچھ ہو پاتا اُودے پور کے اندر اس پر گولی چل

گئی۔ چوں کہ وہ زندہ بچ گیا اس لیے اس کو دھمکی دی گئی ہے اور اس کے خلاف سیاسی دباؤ بنایا گیا ہے۔

سوال: لیکن میں واقعی سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ آئی بی کو میرے بارے میں کیسے پتہ چلا؟

جواب: میڈم، کیوں کہ آئی بی مسٹر مودی کے لیے کام کرتی ہے۔ تم گواہ انل یادرام کا اسٹنگ کیوں نہیں کرتی ہو؟

سوال: لیکن کیوں؟ وہ کیا بتائے گا؟

جواب: ارے۔ اصل کہانی تو وہی بتائے گا۔ کس نے پہلے اس سے رابطہ کیا تھا؟ وہ کیا جانتا تھا اور کیا کہنے کے لیے اُسے کہا گیا تھا۔ چوڑاسما بھی اس معاملے میں ملوث تھا۔ بہت سے مجرموں کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔ چوڑاسما اور دوسرے تمام افسر یہ سب کچھ بروت جیسے انسپکٹروں کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔ بروت ایک انسپکٹر ہے۔ نچلے درجے کا آدمی۔ سارا کاغذی کام وہی کرتا ہے۔

مسٹر پانڈیا کے قتل کے بعد وہ اصغر علی کو پلانٹ کرنا چاہتے تھے جس کے لیے ایک گواہ کی ضرورت تھی۔

سوال: اصغر کو انھیں قید میں کیوں رکھنا پڑا تھا؟

جواب: ان کو کسی مسلم کرایے کے ٹٹو پر الزام ڈالنا تھا، وہ غیر قانونی طور پر قید میں تھا۔ وہ اپنے دفاع میں بعد میں کیا کہے گا؟

اور تمھیں اصغر علی کے اقبال جرم کی ضرورت نہیں ہے ان کو تو بس ثبوت کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ترون بروت، چوڑاسما اور ونجارا اس میں ملوث تھے؟

جواب: ہاں۔

کنہیا نے بس اتنا بیان دیا کہ وہ کار میں جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ہرین پانڈیا کار میں

پڑا ہوا تھا۔

سی بی آئی افسر سشیل گپتا نے گجرات پولیس کی بناوٹی کہانی کی تصدیق کر دی۔ گپتا نے سی بی آئی سے استعفیٰ دے دیا اور اب سپریم کورٹ میں وکیل ہے۔ وہ ریلائنس کے لیے اجرت پر کام کرتا ہے۔ اس سے پوچھو کہ سی بی آئی سے اس نے استعفیٰ کیوں دیا۔ وہ سپریم کورٹ میں بیٹھتا ہے۔ اس سے ملو۔

سوال: تو کیا سی بی آئی نے اپنی تحقیقات نہیں کیں؟

جواب: اس نے بس لیپا پوتی کی ہے۔ اس نے گجرات پولیس افسران کے ذریعے دی گئی پوری تھیوری کو جوں کا توں مان لیا۔

سوال: کیا یہ ایک سیاسی قتل ہے؟

جواب: سب ملوث تھے۔ یہ تو اڈوانی تھا جس کی وجہ سے اس معاملے کو سی بی آئی کے حوالے کر دیا گیا کیوں کہ وہ نریندر مودی کا گرو تھا۔ تو یہ سب اس کا نام صاف کرنے کے لیے کیا گیا۔ میرا مطلب ہے کہ لوگ مقامی پولیس کی کہانی پر اعتبار نہیں کریں گے لیکن سی بی آئی کی کہانی پر تو اعتبار کر ہی لیں گے نا۔

مفتی بہت بعد میں فرار ہوا۔

سوال: اس میں رول کس کا تھا؟ بروت کا یا ونجارا کا؟

جواب: تینوں کے تینوں شامل تھے۔

بروت کہیں اور تھا اور چوڑاسما کو ڈیپوٹیشن پر لایا گیا تھا۔ ان لوگوں نے چوڑاسما کو پالیا تھا وہ سرکار کے لیے کام کرتا ہے۔ اس انکاؤنٹر سے پوربندر کا تار بھی جڑا ہوا ہے۔ یہ ایک اندھا کیس ہے۔ انھوں نے بس اصغر علی اور گواہ کو فٹ کر دیا ہے۔ کرائم برانچ کے ذریعے تحقیقات کی گئی تھیں لیکن کوئی اس تحقیقات کو نہیں مانتا، خود وٹھل پانڈیا بھی نہیں مانتا۔

سوال: سی بی آئی نے اس کا اعتبار کیوں کیا؟

جواب: سی بی آئی نے اس کیس میں مودی کو بچایا تھا۔

جیسا کہ ہم کہا کرتے ہیں کہ کچھ بیانات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس آدمی نے مبینہ طور پر ہرین پانڈیا پر گولی چلائی وہ اصغر علی حیدرآباد کی جیل میں ہے۔ دوسرے لڑکے جن کو گرفتار کیا گیا ان کا تعلق آندھرا پردیش سے تھا اور ان لوگوں سے بھی ان کے تار جڑے ہوئے تھے جو تلسی پرجاپتی اور سہراب قتل معاملوں میں ملوث تھے۔ تو صحیح معنی میں ہرین پانڈیا کو کس نے مارا؟ کیا شیخ گپ ہانک رہا تھا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے گا؟ وہ تحقیقاتی افسر تھا جس نے متعلقہ کاغذات پر دستخط کیے تھے۔ شروعاتی دور کی تحقیقات اسی نے کی تھیں اور اس کے بعد اَبھے چوڑاسما نے تحقیقات کی تھیں۔ بعد میں سی بی آئی نے چوڑاسما کو گرفتار کر لیا تھا۔

سہراب الدین اور پرجاپتی کیوں مار ڈالے گئے تھے؟ آج کی تاریخ تک فلم زیادہ صاف نہیں ہے۔ ایسا کیوں کر ہوا کہ وہی مفتی سفیان جو ہرین پانڈیا قتل کے پیچھے کام کرنے والا سازشی دماغ تھا، جیسا کہ سی بی آئی کی چارج شیٹ سے پتہ چلتا ہے، وہ ریاست سے اتنی آسانی سے نکل کر پڑوسی ملک میں کیسے چلا گیا؟ سفیان کے گھر والے اَبھے چوڑاسما کے اتنے شکر گزار کیوں تھے جب کہ فرضی معاملوں میں بے قصوروں کو پھنسانے کے لیے اس پر فرد جرم عائد کی جا چکی ہے؟

گجرات کے سب سے چہیتے وزیر داخلہ ہرین پانڈیا نے مبینہ طور پر اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ گجرات فسادات معاملے میں شہریوں کے ٹریبونل کے سامنے حاضر ہو گا۔ کیا سچائی کہیں اسی پیشکش میں چھپی ہوئی ہے؟ وقت آ چکا ہے کہ ہم غیر منصفانہ اور متضاد ثبوتوں کی اس بھول بھلیاں سے پردہ اُٹھا دیں۔

☆☆☆

باب یازدہم

حقیقت حال

تحقیقات کی تکمیل کے بعد میں ممبئی آ گئی۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد میرے پاس پی سی پانڈے کا فون آیا یہ دریافت کرنے کے سلسلے میں کہ کیا میں نے اپنی فلم کے لیے تحقیقات مکمل کرلی ہیں؟ اس کا مشورہ تھا کہ میں وزیر اعلیٰ سے مل لوں۔ اس موقع کو میں ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے اعلیٰ ذمہ داروں کو ایک ای میل ارسال کر دیا، شوما اور ترون نے فوراً ہی اس کی اجازت دے دی۔ انھوں نے آخری بار میری مدد کے لیے مائیک کو احمد آباد بھیجنے کا انتظام بھی کر دیا۔ مائیک کے والدین جو اس سے ملنے آئے ہوئے تھے دہلی میں موجود تھے۔ لیکن کسی طرح سے اس نے ایک دن کی خاطر احمد آباد جانے کے لیے بہانہ ڈھونڈ لیا تھا۔

میں نے مائیک کو وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ وزیر اعلیٰ کے گھر پر سخت چوکسی ہو گی لیکن ہمارے لیے وہاں جانا بھی ضروری ہے کیوں کہ اگر ہم ایسا نہیں کرتے ہیں تو پی سی پانڈے کو شک ہو جائے گا۔ ریکارڈ کرنے کی غرض سے میں نے اپنی گھڑی پہن لی جس میں کیمرہ لگا ہوا تھا۔ اس دن ہم نے ایک مقامی شخص سے سیاحتی کار کرایے پر لی۔ چوں کہ اس وقت میں فاؤنڈیشن میں قیام پذیر نہیں تھی لہٰذا میں نے ایک بار پھر ایس جی ہائی وے پر واقع اس ویران بنگلے کی چابیاں ایک دن کے لیے حاصل کر لیں۔ میں اور مائیک مودی کے گاندھی نگر واقع گھر پر مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل ہی پہنچ گئے۔ ہم نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ

قریب میں کہیں گاڑی کھڑی کر دے جب کہ ہم لوگ بے صبری سے گھڑیاں گننے لگے۔ میں گھبرائی ہوئی تھی لیکن مائیک مسکراتا رہا۔ مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ اگر کہیں میری گھڑی میں لگے کیمرے کی طرف سیکوریٹی یا برقی آلے کی توجہ چلی گئی تب تو ہم گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب ہم وزیر اعلیٰ کے گھر میں داخل ہوئے تو میں نے چین کی سانس لی کیوں کہ سیکورٹی سے میں گزر چکی تھی اور پکڑی بھی نہیں گئی تھی۔

مودی کے او ایس ڈی سنجے بھوسار سے ہماری ملاقات ہوئی اور پھر ہمیں وزیر اعلیٰ کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ہمارا استقبال کرنے کے لیے وہ کھڑا ہو گیا۔ مائیک نے پُرجوش انداز میں بتایا کہ اس نے احمد آباد کی گاڑیوں میں اس کی تصویریں دیکھی ہیں اور اس کی مقبولیت سے وہ بہت متاثر ہے۔ باراک اوباما کی زندگی سے متعلق میز پر دو کتابیں رکھی تھیں۔ میں نے فوراً پوچھا: 'سر، کیا آپ اگلے وزیر اعظم ہوں گے؟' اس سوال سے وہ لجا سا گیا اور باراک اوباما کے بارے میں باتیں کرنے لگا کیوں کہ اس کی شخصیت سے اس کو تحریک ملتی تھی پھر اس نے سوامی ویکانند کی خوبیاں بھی بیان کیں۔ تقریباً تیس منٹوں کی گفتگو کے بعد وزیر اعلیٰ نے بھوسار کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ہمیں وہ سارا مواد دکھا دے جو اس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ بھوسار ہمیں اپنے کیبن میں لے گیا۔ اس کی میز پر ان کہانیوں کے نسخے پڑے تھے جو تہلکہ اور دی ہندو میں وزیر اعلیٰ کے بارے میں شائع ہوئے تھے۔ میں نے جب ان کے بارے میں دریافت کیا تو بھوسار کا جواب تھا کہ وزیر اعلیٰ کے بہت سے دشمن ہیں۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ مائیک زیر لب مسکرا رہا ہے۔ بعد میں ہمیں وزیر اعلیٰ کی تصانیف بھی دکھائی گئیں اور ان کی ان تقریروں کی ریکارڈنگ بھی سنائی گئی جو اس نے بھارت اور دنیا کے مختلف گوشوں میں کی تھیں۔

بھوسار نے مجھ سے کہا کہ ان تمام چیزوں کی ایک ایک کاپی میں اپنے ساتھ رکھ لوں کیوں کہ اس سے مجھے اپنی فلم بنانے میں مدد ملے گی۔ میں نے کہا کہ اپنی دوسری ملاقات میں

اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ اس کے بعد ہم واپس اپنے گھر آ گئے وہاں مائیک نے اپنا بیگ تیار کیا۔ اُسے دہلی کے لیے پرواز لینی تھی۔ اس کے ایئرپورٹ جانے کے لیے میں نے ٹیکسی منگوا لی تھی پھر گلے لگا کر اس کو الوداع کہا۔ کچھ منٹوں کے بعد مائیک نے فون کر کے بتایا کہ جب وہ ایئرپورٹ پہنچا تو دیکھا کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ لیکن ٹیکسی والے نے نہ صرف اس کا کرایہ چھوڑ دیا بلکہ اس کے سفر کے لیے ۲۰۰ روپے بھی دیے۔ مائیک نے کہا کہ گجرات سے وہ اپنے ساتھ اس یاد کو لے جانا چاہے گا۔ میں نے تہہ دل سے اس بات سے اتفاق کیا۔ وہ آخری موقع تھا جب میں نے مائیک کو دیکھا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی رہے گا میتھلی کو ضرور یاد رکھے گا جو اس کی بڑی بہن بھی تھی اور ایک دوست بھی۔

میں نے فوراً شوما کو فون کر کے ساری تفصیلات سے مطلع کر دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا فسادات کے بارے میں میں نے وزیر اعلیٰ سے سوالات کیے تھے؟

میں نے کہا کہ تم بھی کمال کرتی ہو شوما، اپنی پہلی ہی ملاقات میں یہ آخری بات ہوتی جو میں پوچھتی۔

اسی دن شام کے وقت شوما کا میرے پاس فون آیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ رعنا، تم دہلی واپس آ جاؤ۔ میں نے ابھی احتجاج کرنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ بولی کہ جب تم دہلی پہنچ جاؤ گی میں تو وضاحت سے سب کچھ تمھیں بتاؤں گی۔

دوسری صبح دہلی پہنچ کر میں سیدھی تہلکہ کے دفتر میں گئی۔ مودی کی ریکارڈنگ والی فوٹیج کو میں نے اپنے لیپ ٹاپ میں منتقل کیا۔ ترون اپنی کیبن میں موجود تھا۔ بعد میں شوما بھی وہاں آ گئی۔ میں نے انھیں فوٹیج دکھائے۔ اوباما کی کتابیں دیکھ کر وہ ہنس پڑے۔

میں نے پوچھا کہ آخر مجھے کیوں واپس بلایا گیا ہے؟ اس کے دفتر سے میرے پاس کچھ ہی دنوں میں فون آنے والا ہے اور مجھے اس سے ملنے کے لیے دوبارہ جانا ہو گا۔

ترون نے کہا: 'دیکھو رعنا، بنگارو لکشمن پر تہلکہ کے اسٹنگ کے بعد انھوں نے ہمارا

دفتر بند کر دیا تھا۔ اب مودی کا سب سے طاقت ور شخص بننا لگ بھگ طے ہے۔ وہ اگلا وزیر اعظم ہو گا۔ اگر ہم اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو ہم ختم ہو جائیں گے۔'

میں اس دلیل سے مطمئن نہیں تھی۔ کیا پورا اسٹنگ آپریشن ہی بجائے خود ایک بڑا خطرہ نہیں تھا؟ لیکن میری ہر دلیل کے جواب میں صرف 'نہیں' ملا۔

اسی شام کو سنجے بھوسار کا میرے پاس فون آیا۔ میں نے گھنٹی بجنے دی۔ اس نے تین بار فون کیا، اور آخر میں ایک پیغام چھوڑ دیا کہ اگلے اتوار کو وزیر اعلیٰ مجھ سے ملنا چاہیں گے۔ میں مقامی پی سی او میں گئی اور بھوسار کو فون کر کے بتایا کہ میں دہلی میں ہوں اور میرے ایک رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے، اس لیے مجھے شہر میں رہنا پڑے گا۔ البتہ میں نے اُسے یقین دلایا کہ ایک ہفتے میں میں اس سے رابطہ قائم کروں گی۔ دو دن کے بعد میں نے اپنے فون سے یونینار کا سم کارڈ ہٹا دیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوڑے دان میں ڈال دیے۔ میں نے فون کا بھی یہی حشر کیا۔ اس دن میتھلی ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔

ایڈیٹروں نے یہ فیصلہ کیا کہ تفتیش شائع نہیں کی جائے گی۔

اس دن سے میں خاموش رہی۔

اب تک۔



حواشی

(۱) ۱۹سالہ عشرت جہاں کو ۱۵/جون ۲۰۰۴ء کو ان تین افراد کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا جن کے ساتھ وہ موجود تھی۔ یہ قتل پولیس اہلکاروں کی ایک جماعت نے گجرات کے شہر احمد آباد کے قریب کیا تھا۔ احمد آباد کی مقامی پولیس نے اس وقت یہ الزام عائد کیا تھا کہ مقتولین پاکستانی دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ کا حصہ تھے اور گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے قتل کے منصوبے میں ملوث تھے۔ دیگر مقتولین کی شناخت بطور ذیشان، امجد علی اور جاوید شیخ کے طور پر ہوئی تھی۔

(۲) http://www.tehelka.com/2011/12/dead-man-talking/

(۳) http://www.tehelka.com/2010/07/breakthrough-expose-so-why-is-narendra-modi-protecting-amit-shah/

(۴) http://www.tehelka.com/2013/07/tehelka-expose-validated-cbi-says-ishrat-jahan-encounter-fake/

(۵) http://www.outlookindia.com/newswire/story/ishrat-jahanencounter-fake-cbi-chargesheet/802685

(۶) http://timesofindia.indiatimes.com/india/DG-Vanzaras-letter-tochief-secretary-Gujrat-government/articleshow/47201125.cms

(۷) http://cbi.nic.in/newsarticles/pressclips/aug_2013/pc_20130802_4.pdf

(۸) اس بے عزتی کے پیش نظر جو مانسی سونی کو اس کہانی کے عام ہونے کے بعد سہنی پڑی، اور اپنے خاندان کے دباؤ کی وجہ سے اس کے امریکہ منتقل ہونے کے مد نظر میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ میں نے آخر فیصلہ کیا کہ اس کیس پر فوٹیج کو شائع نہ

حواشی

(۱) ۱۹ سالہ عشرت جہاں کو ۱۵/جون ۲۰۰۴ء کو ان تین افراد کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا جن کے ساتھ وہ موجود تھی۔ یہ قتل پولیس اہلکاروں کی ایک جماعت نے گجرات کے شہر احمد آباد کے قریب کیا تھا۔ احمد آباد کی مقامی پولیس نے اس وقت یہ الزام عائد کیا تھا کہ مقتولین پاکستانی دہشت گرد تنظیم لشکر طیبہ کا حصہ تھے اور گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے قتل کے منصوبے میں ملوث تھے۔ دیگر مقتولین کی شناخت بطور ذیشان، امجد علی اور جاوید شیخ کے طور پر ہوئی تھی۔

(۲) http://www.tehelka.com/2011/12/dead-man-talking/

(۳) http://www.tehelka.com/2010/07/breakthrough-expose-so-why-is-narendra-modi-protecting-amit-shah/

(۴) http://www.tehelka.com/2013/07/tehelka-expose-validated-cbi-says-ishrat-jahan-encounter-fake/

(۵) http://www.outlookindia.com/newswire/story/ishrat-jahanencounter-fake-cbi-chargesheet/802685

(۶) http://timesofindia.indiatimes.com/india/DG-Vanzaras-letter-tochief-secretary-Gujrat-government/articleshow/47201125.cms

(۷) http://cbi.nic.in/newsarticles/pressclips/aug_2013/pc_20130802_4.pdf

(۸) اس بے عزتی کے پیش نظر جو مانسی سونی کو اس کہانی کے عام ہونے کے بعد سہنی پڑی، اور اپنے خاندان کے دباؤ کی وجہ سے اس کے امریکہ منتقل ہونے کے مد نظر میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ میں نے آخر فیصلہ کیا کہ اس کیس پر فوٹیج کو شائع نہ

کروں۔

(۹) http://www.tehelka.com/2011/04/gujarat-ex-intelligence-chief-blames-modi-for-gujarat-riots/

(۱۰) http://timesofindia.indiatimes.com/defaultinterstitial_as.cms

(۱۱) http://blogs.timesofindia.indiatimes.com/masala-noodles/is-parveen-togadia-getting-back-at-narendra-modi-through-hardik-patel/

(۱۲) https://youtu.be/f0HfmQY8aOw

(۱۳) http://indianexpress.com/article/india/india-others/gujarat-ips-officer-rahul-sharma-who-took-on-govt-to-retire/

(۱۴) ایضاً

(۱۵) http://www.tehelka.com/2011/02/senior-ips-officer-sanjeev-bhatt-arrested-in-ahmedabad/

(۱۶) http://epaper.timesofindia.com/Default/Layout/Includes/MIRRORNEW/ArtWin.asp?From=Archive&Source=Page&Skin=MIRRORNEW&BaseHref=PMIR%2F2010%2F07%2F27&ViewMode=HTML&PageLabel=9&EntityId=Ar00900&AppName=1

(۱۷) http://timesofindia.indiatimes.com/city/ahmedabad/Gujarat-DGPfires-a-salvo-at-govt-over-police-transfers/articleshow/4994912.cms

(۱۸) یہ اعتراف اہم ہے کیوں کہ چکرورتی پر ناناوتی کمیشن کے سامنے ریاست کے کردار کے متعلق نسیان طاری ہو گیا تھا اور مختلف موقعوں پر اس نے مبہم بیانات دیے تھے۔

(۱۹) جب چکرورتی کہتا ہے کہ ناناوتی کمیشن حکومت کے لیے زیادہ موثر رہا تو اس کی

مراد یہ ہے کہ یہ کمیشن جو جسٹس ناناوتی کی نگرانی میں تشکیل دیا گیا تھا وہ مودی سرکار کے حق میں تھا۔

(۲۰) یہاں چکرورتی کی مراد یہ ہے کہ اس نے کسی دوسرے افسر کے بحیثیت ڈی جی جوائن کرنے کے ڈر سے استعفیٰ نہیں دیا تھا جو حکومت سے فسادات کے دوران منظم انداز میں مسلمانوں کو ہدف بنانے میں ساز باز کرتا۔

(۲۱) یہاں حوالہ ۲۷ فروری کی اس میٹنگ کا ہے جس میں مودی نے مبینہ طور پر اپنے افسروں کو بلا کر کہا تھا کہ مسلمانوں کو ماریں۔ اس اسٹنگ آپریشن کے دوران جمع کیے گئے مختلف ورژن سے یہ کہیں نہیں ملتا کہ مودی نے ایسا کوئی حکم دیا تھا۔ لیکن چکرورتی اور ناناوتی دونوں نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر ریاستی افسروں کو حکم دیے گئے تھے۔ پی سی پانڈے نے تقریباً اس بات کی تصدیق کر دی جب اس نے کہا کہ وزیر اعلیٰ اتنا بھولا تو نہیں ہو سکتا کہ اتنے نازک حالات میں، جب بھارت کی تاریخ میں پہلی بار فسادات مین اسٹریم میڈیا کے ذریعے لائیو کور کیے جا رہے تھے، اتنا بڑا خطرہ مول لیتا۔

(۲۲) چکرورتی کلدیپ شرما کے بارے میں بات کر رہا ہے جو گجرات کا ڈی جی بننے والا تھا لیکن گجرات سرکار نے بیچ میں اس کے خلاف ایک ۲۰ سال پرانے انکاؤنٹر کا کیس کھول دیا۔ اس لیے کہ مبینہ طور پر شرما نے وزیر داخلہ امت شاہ کو ایک کوآپریٹیو گھوٹالے میں چیلنج کیا تھا۔ شاہ کلدیپ اور پردیپ سے بھی ناراض تھا کیوں کہ انھوں نے مبینہ طور پر انھوں نے جاسوسی والے اسکینڈل کی پول کھولی تھی جس میں امت شاہ کی ریکارڈنگ جی ایل سنگھل کو ایک عورت کی جاسوسی کرنے کا حکم دیتے ہوئے کی گئی تھی۔ اس ریکارڈنگ میں اس نے کہا ہے کہ یہ 'صاحب' کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔ مانا جا رہا ہے کہ 'صاحب' سے مراد دراصل نریندر مودی ہے۔

(۲۳) http://www.tehelka.com/2010/09/geeta-johri-was-known-to-be-a-fearless-officer-so-what-accounts-for-her-flip-flops/

(۲۴) http://www.dnaindia.com/india/report-arun-jaitley-writes-to-pm-oncongress-dirty-war-against-narendra-modi-1896969

(۲۵) http://www.ndtv.com/cheat-sheet/jailed-cop-dg-vanzara-attacksamit-shah-gujarat-government-over-fake-encounters-533486

(۲۶) http://indiatoday.intoday.in/story/jagruti-haren-pandyas-wifeto-contest-gujarat-polls-keshubhai-patel-gujarat-parivartanparty/1/235242.html

(۲۷) مفتی سفیان ایک مقامی مولوی تھا اور اس قتل کا ماسٹر مائنڈ تھا جو پانڈیا کے قتل کے بعد بآسانی ریاست سے فرار ہو گیا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ احمد آباد میں پولیس ہیڈکوارٹرز کے قریب رہنے کے باوجود وہ پانڈیا کی موت کے ایک ہفتے کے اندر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔



گجرات فائلس

پسِ پردہ حقائق کا انکشاف



رعنا ایوب

ترجمہ

ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ ندوی

پیش لفظ

جسٹس بی این سری کرشنا

مضامین پبلکیشنز

'اس کتاب میں شامل سینئر افسروں اور پولیس اہل کاروں سے کیے گئے مکالمات اس ملک کی عدالتوں میں زیر سماعت متعدد معاملوں کے شواہد کو سیاق وسباق اور تقویت فراہم کرتے ہیں۔ یہ جرائم نہایت ہی سنگین ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ایسے مجرموں کے ساتھ کیا رویہ روا رکھیں گے جو اس ملک کے طاقت ور ترین افراد میں سے ہیں؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے ہمارا خود اپنے ساتھ کیا برتاؤ ہو جب کہ ہم نے ہی انھیں اقتدار تک پہونچایا ہے۔'

اروندھتی رائے

'**گجرات فائلس** ایک جرأت مندانہ اور اہم کتاب ہے۔'

رامچندر گہا

'رعنا جیسی آوازوں کے بغیر ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہوتا جو سیاسی طور پر معقول 'تاریخ' کا ملغوبہ بن کے رہ جاتا۔ میں رعنا کا مشکور ہوں جنھوں نے اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے۔'

ہنسل مہتا

'جنھیں اداروں اور عدلیہ کے نظاموں کی پرواہے، **گجرات فائلس** ان کے لیے ایک بانگ جرس ہے۔'

آوٹ لک

₹260

ISBN: 978-81-933600-0-2



Non fiction

mazameen.com

مضامین

تجزیے · مقالات · ادب

کور ڈیزائن: انشکا ورما